جہلم کا تیسرا کنارا

افسانوی مجموعہ

اہد مختار

Graphics by: almukhtar comp Ang

برادرم جاوید آذر

کی خدمت میں

ایک ادنیٰ سا تحفہ

زاہد مختار

۱۰ رجون ۲۰۰۵ء

جہلم کا تیسرا کنارا

افسانوی مجموعہ

ابھی ہے سُلگتے چناروں کی برسی
ابھی ننھی چھاؤں کا چہلم ہے باقی
ابھی سونا سونا یہ میرا چمن ہے
ابھی اپنے جہلم کا عریاں بدن ہے

زاہد مختار

المختار پبلی کیشنز

نئی بستی اسلام آباد کشمیر

PH: NO: (01932) 222192

☆ نام کتاب: جہلم کا تیسرا کنارا

☆ مصنف: زاہد مختار

☆ پہلا ایڈیشن: ۲۰۰۴ء

☆ کمپیوٹر کمپوزنگ: المختار کمپیوٹرز اننت ناگ کشمیر

☆ ناشر: المختار پبلی کیشنز، کشمیر

☆ قیمت: ڈیڑھ سو روپے (RS: 150/-)

☆ سرورق: عادل مختار

☆ چھاپ خانہ: چمن انٹر پرائیز ز دہلی

JAHLIM KA TEESRA KINARA

SHORT STORY COLLECTION

BY

ZAHID MUKHTAR

ALMUKHTAR PUBLICATIONS

اِنتساب

اپنے والدِ محترم

مرحوم حاجی ثناءاللہ صاحبؒ

کے اُس علمی اور دینی اُنس کے نام

جس نے مجھے بھی

طالبِ علم بنادیا

زاھد مختار



ابھی بادلوں کی سیاہ وحشتوں میں

مقید وہ سورج سُلگ ہی رہا ہے

ابھی سرحدوں پر ٹھٹھرتی ہوائیں

چمکتی کرن کا لہو چوستی ہیں

ابھی رات کا ایک سہما سا آنچل

درِ دل کی دستک سے دہشت زدہ ہے

ابھی چاندنی خود میں خود کو چھپائے

ہر اک داغِ دامن پہ ماتم کناں ہے

ابھی نیم شب میں وہ تاروں کی محفل

بہت منتشر ہے کہ زخمی جگر ہے

ابھی تو تبسم کی خوشبو ہے چھلنی

ابھی لب کے صحرا میں اک تشنگی ہے

ابھی ہے سلگتے چناروں کی برسی

ابھی ننھی چھاؤں کا چہلم ہے باقی

ابھی سونا سونا یہ میرا چمن ہے

ابھی اپنے جہلم کا عریاں بدن ہے



اس مجموعے میں شامل تمام افسانے فرضی ہیں کہیں کسی جگہ، کردار یا واقعے کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جسکے لئے مصنف یا پبلشر پر کوئی ذمہ داری عائید نہیں ہوتی

رشحاتِ قلم

☆ | صفحہ نمبر:



بسمہ اللہ الرحمٰن الرحیم

برقِ تخیّل



میں دیباچے کی روایت اب کی بار قائم نہیں رکھ پایا کیونکہ انسان جب اچانک سوچ کے صحرا میں گم ہو جاتا ہے تو خود ہی خود سے کچھ ایسے سوالات پوچھتا ہے جو اُسے شاید نہیں پوچھنے چاہیے لیکن سوالوں کے تیر جب ذہن کی کمان سے نکلتے ہیں تو مضطرِب جوابات کا ایک کارواں بھی سامنے تڑپتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ حقیقت افسانوں کی نہ سہی زندگی کی تصویر (تصدیر) تو بن جاتی ہے۔ شاید یہ قطرے ہی کوئی منظر نگاری کر سکیں:



کتابِ زیست ۔۔۔ تخلیقِ آدم سے ارتقاءُ آدم تک ۔۔ درمیان میں ایک سجدے کا اہم نکتہ، جسکے بغیر ساری داستان نامکمل۔



کچھ لوگوں کو زندگی کے سمندر میں عمر گذارنے کے بعد بھی پیاس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یا تو پانی کھارا ہوتا ہے یا پھر گوہر کی طلب نہیں ہوتی۔ کوئی کوئی رہ گذر پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتا ہے ورنہ لوگ آتے ہیں، لوگ جاتے ہیں۔



نقادوں نے قلم کی زبان سے ٹپکے لفظوں کو کبھی مصرعوں کا عنوان عطا کیا اور کبھی جملوں کا۔ کیا خوبصورت جملے مصرعے نہیں ہوتے اور کیا مصرعہ جملہ نہیں ہوسکتا۔ دراصل ہم کسی چیز کو تب تک نہیں پہچان پاتے جب تک اُن کا ایک نمبر، ایک نام نہ رکھ دیں۔ انسان کی یادداشت کتنی کمزور ہے۔ نسیاں کی زمین سے فراموشی کے پاتال تک۔



لفظوں کا مزاج نرم ہے اسی لئے برسوں سے اس کے ساتھ اُلٹ پھیر کا تماشا ہو رہا ہے۔ تماشائیوں کو رجھانے کا یہ بازار کسی میلے کا محتاج نہیں۔ کہیں بھی کسی بھی زمان و مکان میں لفظ کو اپنی مرضی کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ ایک انسان ہمیشہ دوسرے انسان پر برتری کا تمنائی ہے۔ اس بازار کا سکہ بین الاقوامی حثیت رکھتا ہے۔



روحوں کو بے لگام جسموں کی چاہ نہیں ہوسکتی۔ جب ہم کسی اڑیل گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہونا پسند نہیں کر سکتے پھر بھلا روحوں سے یہ اُمید رکھنا عبث ہے کہ اُنہیں درد نہیں ہوتا۔ جسم کے سکوں کا روح کے سکون سے کوئی مطلب نہیں۔



فرائڈ اور سقراط کے فلسفے کس بنیادی نکتے سے اُبھرے ہیں۔ غالب اور میر نے شاعری کا پہلا درس کہاں سے پایا۔ اقبال ارضی تصور سے اوپر اُٹھ کر آفاقی حقیقت کی جانب کیونکر محوِ پرواز ہوا۔ نیوٹن سے پہلے کیا کسی خردمند نے سیب کو پیڑ سے گرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟ خوبصورت تصویروں کے موجد کا اپنا باطنی رنگ کون سا ہوسکتا ہے؟ اب یہ سوال کون کس سے جا کر پوچھے؟ ہم دراصل آدھی تواریخ کے قاری ہیں۔



کروڑوں برسوں سے آدم اب بھی تلاش کے دائیرے میں مقیّد ہے۔ وہ چاہ کر بھی کئی گوشے چھو نہیں پاتا۔ مکمل کائینات کا یہ شعوری اور تحت الشعوری احساس، لاشعور میں زندگی کا ایک پُر اسرار عکس لئے براجمان ہے، کیا سب کچھ حاصل ہونے کا نام ہی ''قیامت'' ہے؟ پھر انسان کو اپنے فہم وادراک اور علم پہ فخر کیوں؟



میں ایک عرصہ دراز سے سوالوں میں گم ہوں۔ کبھی شاعری کرتا ہوں تو کبھی افسانے لکھتا ہوں۔ صحافت میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہوں اور رنگوں سے بھی کھیلنے کا جتن کرتا ہوں، کبھی خود میں کھو جاتا ہوں اور کبھی خود سے دور بھاگنے کی جستجو کرتا ہوں۔ سوالات اپنی جگہ پہ قایم ہیں اور شاید انہی سوالوں کے طفیل میں بہت کچھ لکھ پاتا ہوں۔ اگر کبھی مجھے ان سوالوں کا جواب مل گیا تو کیا میرا قلم رُک جائے گا؟۔ شاید اُسی کا نام موت ہو۔



میری توقع سے بڑھ کر جب کوئی ادنیٰ سا واقعہ رونما ہوتا ہے تو وہ میرے لئے ایک معجزے سے کم نہیں ہوتا لیکن جب اُمیدوں کے چہروں پر مایوسی چھا جاتی ہے تو پھر میرے اندر خاموشی کی بجائے طلاطم پیدا ہوتا ہے۔ میرے اندر کون ہے جو ہار کر بھی نہیں ہارتا۔ میں نے خود اُسے ہرانے کی کئی بار کوشش کی ہے۔



میں اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ تا حال کرّہ ارض پر موجود ہوں

لیکن کل جب خاک کا احساس مٹ جائے گا تب بھی میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی نام یا کام سے اپنی موجودگی کا احساس دلا دونگا۔۔ جب موجود رہنے کے لئے جسم کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں تو پھر اس جسم کی آرزوئیں پوری کرنے کے لئے اتنا بڑا بازار سجانے کی ضرورت کیوں؟۔۔۔۔



بازار بھی تو بند نہیں کئے جا سکتے، کارگاہِ کائینات کے لئے ہر شئے ضروری ہے۔ خالق کو اپنی ہر تخلیق سے پیار ہے۔۔ پھر بھی ایک بات پھن پھیلائے کھڑی ہے، جب تخلیق اور تخلیق کار کے درمیان ہر عیب اور خوبی سے قطع نظر صرف پیار ہی پیار ہے تو پھر کائینات میں ''نفرت'' کا تخلیق کار کون؟۔ الاماں۔ کیا شیطان اتنا طاقتور ہے؟



کشش زمین و آسمان میں ہے، چاند سورج میں ہے۔ یہاں تک کہ کائینات کے ذرّے ذرّے میں ہے۔۔ آنکھوں میں بھی کشش موجزن ہے۔ دل بھی کشش کا مرہون ہے، ذہن بھی کشش کے سامنے بے بس دکھائی دیتا ہے۔ ان سب جذبوں کا خالق بھی کشش کے طفیل قرب عطا کرتا ہے، پھر خوب کیا اور عیب کیا۔۔ انسان خود ہی کسوٹی اس لئے بنا ہے کیونکہ وہ اشرف المخلوق ہے۔ اندر کی عدالت سے بڑھ کر کوئی عدالت نہیں۔



ماں بچے کو اپنا خونِ جگر پلا کر پالتی ہے۔ بچہ بڑھاپے کا سہارا بنتا ہے۔ محبت محبوب کو خدا بھی بنا دیتی ہے۔ عشق آدم کو ''فنا فی اللہ'' کے عالم میں پہنچا دیتا ہے۔

''من اور تو'' کا فرق ایک منزل پہ آ کے مٹ جاتا ہے۔ اُس منزل کے آگے راستے مسدود نہیں ہوتے۔ وہاں سے زندہ لوٹنے والوں نے پھر بھی اپنی ایک زندگی جی لی یعنی زندگی صرف'' موت وحیات'' کا نام نہیں۔ کاش مجھے اپنی زندگی میں وہاں سے لوٹنے والا کوئی راہی مل گیا ہوتا۔



اس کرّہ ارض پر خون کے رشتوں کو سب سے زیادہ اہمیت اور اپنائیت حاصل ہے لیکن نہ جانے کیوں خون کے رشتوں میں بھی اکثر Blood Group ایک جیسا نہیں ہوتا۔ عالم کے گھر سے عیار اور عیاش کے گھر سے عامل کیوں اُبھرتا ہے۔ اخروٹ کے درخت پر تو کبھی کھجور نہیں اُگتے۔ انسانی ارتقا کی تھیوری ہی غلط ہے؟



خلوص، ہمدردی کی قبا اوڑھ لے تو کبھی توہینِ ذات لیکن محبت کا پیراہن پہن لے تو جان و دل قربان کرنے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔



فلسفے صحیح ہیں یا غلط، اس کا فیصلہ کون کرے۔ زندگی کی حقیقت اس میں مخفی ہے کہ تہہ در تہہ سچائیوں کو بے نقاب کیا جائے۔ ایک اَن دیکھی عظمت کے خزینے تلاش کئے جائیں لیکن تلاش کا شعور بھی ودیعت کا مرہون ہے۔ جنت کا ایک میوہ افزائشِ آدم کا مرتکب بنا۔ اگر سب کچھ پہلے سے ہی طے ہے تو پھر'' تلاش حق'' اور'' منکرِ ذات'' کی منطق کیا؟



سڑکیں آج بھی وہیں سے گذرتی ہیں جہاں برسوں پہلے رواں دواں تھیں۔ فرق یہ ہے کہ تب اُن پہ انسانی قدموں کے نشان اُبھرتے تھے اب پہیوں کی لکیریں۔ رفتار ایک ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ یہ سب انسان کی عجلت پہ منحصر ہے، سڑک نے اپنا زاویہ نہیں بدلا، شہر وسیع سے وسیع تر ہو گئے لیکن ایک گھر سے دوسرے گھر تک کا فاصلہ وہی رہا جو پہلے تھا۔



پہلے خدا کے گھر میں بام و در کھلے رہتے تھے اور عام گھر مقفل، لیکن اب گھر اور چوراہوں کا منظر یکساں ہے لیکن خدا کے گھر میں داخل ہونے کے لئے حفاظتی اقدامات کی جدید ٹیکنالوجی سے بنے آہنی دروازوں سے اجازت لینی پڑتی ہے۔



مذہب، قلب کے بازار کا گوہر ہے لیکن اسکی تجارت کا پہلا اشتہار کس ذہن کے چھاپ خانے میں پہلی بار چھپ گیا۔ اسکا کاتب ضرور کوئی ''آدم'' ہی رہا ہوگا۔

موت برحق ہے لیکن اس کا ناحق فرمان جاری کرنے والا کیا خود ''آب حیات'' کے سمندر میں ڈبکی لگا کر آتا ہے۔



جب بارشیں بن بلائے مہمان کی طرح آ کے جانے کا نام نہیں لیتیں تو سیلاب کا منظر دیکھنے کو ملتا ہے اور جب برسات آنے کا نام ہی نہیں لیتی تو قحط جنم لیتا ہے۔ توازن عنقا اور جستجو باقی۔ دیکھنا یہ کہ سرخروئی کسے حاصل ہوتی ہے۔ آدم کی تلاش یا کائینات کی ورق ورق عیاں ہوتی ہوئی لغت کو۔



خوبصورت تحریر کے لئے ہاتھ خوبصورت ہونا ضروری نہیں۔ خوبصورت نام والا بھی عیوب و آزار کی ایک زندہ مثال ہوسکتا ہے۔ شاندار لباس سلیقے کا عنوان ہوسکتا ہے لیکن جسم کی اندرونی عیاشی کا پردہ نہیں۔ سیرت صورت کی محتاج نہیں۔ بدصورت شئے کی اپنی ایک صورت ہے۔ گندی نالی میں بہنے والا کیڑا ابھی کبھی کسی حکیم کی حکمت میں ''شفا'' کا باعث بن سکتا ہے۔ اس تضاد میں بھی کوئی نہ کوئی بات ضرور مشترک ہے۔!



پُرسکون نیند تب بھی موجود تھی جب آدم نے آرام دہ بستر کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اب نیند کی گولیاں عام بکتی ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ وہ پیچھے مڑ کے دیکھنا نہیں چاہتا۔ سادگی ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔



حاتم، لقمان، بڈشاہ اب کہیں نظر نہیں آتے۔۔ خاکِ آدم نایاب ہے۔ اب صرف ہٹلر، چنگیز، ہلاکو اور سکندر جنم لیتے ہیں۔ آج کا آدم شاید کچرے سے تخلیق ہوتا ہے۔



رشوت اور بے ایمانی کے تمام ہتکھنڈوں سے حاصل کی گئی دولت سے جو محل تعمیر ہوتے ہیں اُن پر ''ھٰذا مِن فضلِ ربی'' لکھوانے والا توہین کا مرتکب قرار کیوں نہیں دیا جاتا۔



انسان کتنا چالاک ہے۔ یہ اپنے سفید جھوٹ سے خود کو بھی مطمئین کرتا ہے آنکھ والا ہی ساری دنیا نہیں دیکھتا۔ اندھے کی بھی اپنی دنیا ہوتی ہے جیسے نیند کے بعد ہم سب کی ایک اپنی الگ الگ دنیا۔ خواب کسی کی میراث نہیں، اسی لئے شاید کسی کچہری میں خوابوں کے تنازعے کھڑے نہیں ہوتے۔



موت بیماری کی بیساکھیوں کے سہارے چل کر نہیں آتی۔ یہ ازل سے ہر ذی روح کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ہمیں اکثر یادوں کی موت ستاتی ہے۔ موت کی یاد نہیں۔ عزت کی خوشبو اونچے مقام پہ نہیں ملتی۔ یہ زمین پر ہی برستی ہے اور ذلّت کے لئے آدمی کو اُونچائی سے گرنا نہیں پڑتا۔ یہ اعلیٰ منصب پر بیٹھے ہوئے فرد کو بھی آگھیرتی ہے اُس بدبو کی طرح جو کسی عالیشان حویلی کے باہر گذرتی ہوئی گندی نالی سے اُٹھتی ہے۔



دودھ کے ایک پورے مٹکے کو ایک قطرہ گندہ پانی ناپاک کر دیتا ہے لیکن گندی نالی میں دودھ کا مٹکا بہانے سے نالی پاک نہیں ہوتی۔ اصلاح کے دروازے محدود ہیں۔ صُمٌ بُکمٌ عُمیٌ فُھم لایرجِعوُن ۔



کچھ لوگوں کو اپنی ذات (Caste) اچھی نہیں لگتی۔ وہ ذات بدلنے کے لئے گھر کے آہنی دروازے پر اپنے پرانے نام کی تختی کے ساتھ نئی ذات کا ذی شان لفظ جوڑ دیتے ہیں لیکن عمر بھر گھر کے مکیں اس تختی سے مانوس نہیں ہو پاتے۔ آدمی کے تین روپ ہیں ایک وہ جو وہ اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ دوسرا جو لوگ اُسے سمجھتے ہیں اور تیسرا جو وہ

حقیقت میں ہوتا ہے۔



اگر ساری کائینات میں سب سے شفیق ذی روح ماں ہے تو پھر خدا نے آدم کے لئے سب سے پہلا ساتھی ''بیوی'' کی شکل میں کیوں پیدا کر دیا؟



دردِ دل میٹھا میٹھا ہو تو سکون روح، تکلیف دہ ہو تو عذاب جاں اور ناقابل برداشت ہو تو صدائے اجل۔

خوبصورت لفافے میں بری خبر کا متن نہیں بدلتا۔۔ بنا لفافے کا تار بھی کبھی ساری دنیا کی خوشیاں لیکر آتا ہے۔۔ اکثر لوگ لباس میں بھی عریاں دکھائی دیتے ہیں لیکن میں نے ایسے عریاں لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو بے ستر نہیں ہوئے تھے۔



ماں اُس ''محفل'' کی شمع ہے جس میں بہن، بیٹی، بیوی اور محبوبہ کی کرنیں پھوٹتی ہیں لیکن مرد ہر حال میں اُس محفل کا نگہبان۔ فِبِاَیِء اٰلاَءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ.



مجھ سے ایکبار ایک دوست نے پوچھا تھا۔ یہ مختار کے ساتھ زاہد کیوں۔ دونوں میں بہت تضاد ہے ایک اپنی ہر بندش سے آزاد لیکن دوسرا اپنی ہی حدوں میں قید۔ میں نے اُسکا سوال اپنے آپ سے بھی پوچھ لیا، ٹھیک اُسی لمحے میرے بچے نے سفید اُجلے کاغذ پر کالی سیاہی سے ایک خوبصورت حرف لکھ دیا اور مجھے سوال کا جواب مل گیا۔



تلوار اپنی فطرت سے مجبور ہے ورنہ بخوبی جانتی ہے کہ قلم کی زبان بار بار کاٹنے کے باوجود بھی وہ ہر دور میں اُس سے ہار جاتی ہے۔ اب تو کمپیوٹر کا زمانہ ہے جسکا قلم بِنا زبان کے بھی بہت بولتا ہے اسی لئے شاید آج بھی کمپیوٹر، ٹینک سے زیادہ تیز چلتا ہے۔



میرے بیٹے نے انٹرنیٹ کے طفیل ساری دنیا کو اپنے کمرے میں سمیٹ لیا ہے لیکن وہ آج بھی پہلگام، گلمرگ جانے پہ بضد ہے اور لمبی خوبصورت سڑک پر کار ڈرائیو کرنے کا شوقین۔

محبوبہ اور بیوی میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ محبوبہ گھر کی ذمہ داری نہیں اُٹھاتی، پھر بھی نہ جانے کیوں مرد ساری عمر محبوبہ کا ہی غم اُٹھائے جی لیتا ہے شاید آدم بیوی کو محبوبہ نہیں بنا سکتا۔ اسی لئے تو جنت مل کر بھی حاصل کرنے کی جستجو کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ایک میوہ کھانے کی اتنی بڑی سزا؟



میرے والد صاحب (مرحوم مغفور) نے ایک بار مجھ سے یہ کہا تھا کہ جس دن دنیا کا ایک فرد میرے لکھے ہوئے ایک جملے سے متاثر ہوگا اُس دن مجھے یہ جان لینا چاہیئے کہ مجھے قلم تھامنا آتا ہے۔ آج میرا بیٹا جوان ہو گیا ہے لیکن میں اب بھی صحیح طور سے قلم پکڑنے کی سعی کر رہا ہوں۔



میری والدہ اپنی آخری سانس تک میرے سکول یا کام سے لوٹنے پر میرا انتظار

کررہی ہوتی تھی۔ میں آج بھی کام سے لوٹتا ہوں لیکن اکثر یہ بھول جاتا ہوں کہ اب میرے گھر میں کوئی ماں نہیں رہتی۔



بیٹی جنم لیتے ہی پرائی کہلاتی ہے لیکن وہ مرنے تک بھی اپنے میکے کو پرایا نہیں سمجھتی۔ وہ جس گھر کا وارث پیدا کرتی ہے اُس گھر میں اُسے کبھی بیٹی کا درجہ عطا نہیں ہوتا۔ دراصل عورت ایک ہی بار چار جنم لیتی ہے۔



خوف، نہ رات کی سیاہی میں ہے اور نہ دن کے اُجالے میں۔ خوف تو انسانی ذہن کی اختراع ہے بلکل ویسے ہی جیسے اس بات پہ اعتماد کی حد تک یقین کرلینا کہ کار کا حادثہ، جہاز کے حادثے سے کم تکلیف دہ ہوتا ہے۔



میری ذاتی ڈائیری میں میرے دوستوں کے موبائیل یا فون نمبر لکھے ہیں اُن کے گھر کے پتے نہیں کیونکہ اب Communication Gap فون سے گھٹتی ہے۔ ملاقات میں اب اختلافات کی گنجائش زیادہ رہتی ہے۔ آدمی آدمی سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہی نہیں۔



بھیڑ کے جسم پہ جو چربی چڑھ جاتی ہے اُسے ہم بڑے شوق سے اپنے جسم پر چڑھا لیتے ہیں۔



میں اپنی ہر نئی کتاب یا اپنا ہر نیا ڈرامہ، غزل یا افسانہ صرف اپنے لئے لکھتا ہوں۔ جب اُسے دوسرے سنتے ہیں تو وہ اُنہیں ادبی جنون کا عنوان عطا کرتے ہیں۔ اُنہیں شاید یہ نہیں معلوم کہ جنون کے جذبے سے روٹی کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔



منٹوؔ سے مختارؔ تک افسانوں کی ارتقا کا گراف کھینچنے والوں کے ہاتھ میں ایسا کون سا Marker ہے جو دوسروں کو استعمال کرنا نہیں آتا، کچھ تو ہے جو شعور کی وسعتوں میں تفاوت کا ضامن ہے۔ زاہد مختار، منٹوؔ یا غالبؔ نہیں بن سکتا لیکن غالبؔ بھی تو مختارؔ کے قالب میں سما ہی نہیں سکتا۔



جس دن میں اپنے اساتذہ کا مرہون بنونگا اُس دن میں خود ایک اُستاد بن جاونگا۔ ٹوٹے دھاگے سے تسبیح پوری نہیں ہوتی۔



کچھ قلمکار اردو کا کھاتے ہیں اور کشمیری میں لکھتے ہیں لیکن کچھ ہیں کہ کشمیری کا کھاتے ہیں اور اردو میں بھی نہیں لکھتے۔

مجھے انگریزی کے اُتنے ہی الفاظ یاد ہیں جتنے کشمیری کے، اردو مجھے لکھنی آتی ہے لیکن کشمیری پڑھنی نہیں آتی۔ انگریزی ابھی میں سیکھنے کی سوچ رہا ہوں۔ کیا معلوم کسی اکادمی نے میرے نام بھی کوئی ایوارڈ رکھا ہو۔



انسان ایسا دعویٰ کبھی نہیں کر سکتا کہ خدا اُسے ہر حال میں دکھائی دیتا ہے لیکن

خداانسان کوگناہ کرتے ہوئےنہیں دیکھتا،آدم اورحوا کی نسل اکثرایسا سوچتی ہے۔



میں جب خدا کو یاد کرنا چاہتا ہوں تو مجھے ''وہ'' یاد آتا ہے اور جب ''وہ'' مجھے بھول جاتا ہے تو مجھے خدا یاد آتا ہے۔



انسان راستے کا غلام ہو جائے تو مقصد کے قرب کو حاصل نہیں کر سکتا، مقصد کو ذہن میں لے کر چلے تو راستے خود بخود اُس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ میں اور میرے اکثر ہم عصران دونوں باتوں کو جان کر بھی پس پشت ڈال چکے ہیں۔



میں اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ آدم کے پہلے حرف سے لیکر آج کے آخری کلمے تک جو کچھ کہا گیا وہ اللہ نے کہلوایا ہے۔ لیکن جب کسی کو بدکلامی کرتے ہوئے سنتا ہوں تو میرا یہ اعتقاد اور پختہ ہو جاتا ہے کہ کچھ لوگ ازل سے ہی کتاب زیست کے افسانے میں ''بُرے آدمی'' کا رول ادا کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

زاہدمختار

نئ بستی اسلام آباد کشمیر

۲۰۰۴ء

میری کہانی کا افسانہ

ابتدا : غم ہو یا خوشی .... کسی بھی حال میں کوئی تنہا نہیں، ہر کوئی کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہے، سب بیساکھیوں کے سہارے چل رہے ہیں...کوئی خود کو نیلامی کے لئے تیار کر رہا ہے اور کوئی نیلام ہو رہا ہے، ہم تو لاشوں اور قبرستانوں کی دنیا میں سسک رہے ہیں، کسی کو جانے پہچانے چہروں میں اپنائیت نظر آتی ہے اور کوئی اپنوں میں بھی پہچان کی رمق نہیں پاتا.......... (ایک ادیب دوست کے نام خط سے)

انتہا: میری وادی میں بہت سارے ادیب رہتے ہیں، قلم کے جادوگر رہتے ہیں، خوبصورت شاعر رہتے ہیں، غضب کے افسانہ نگار رہتے ہیں اور اعلیٰ پایۂ کے ڈرامہ نگار رہتے ہیں لیکن صاحب دل کہاں گئے کسی کو خبر نہیں، سبھوں نے واردات روز وشب کو، ظلمتوں اور ضیا پاشیوں کو متاع دکان بنا دیا ہے، ہم میں کوئی کسی کی خبر نہیں رکھتا، کوئی یادوں کے گلشن نہیں مہکاتا، کوئی خلوص کی آبیاری نہیں کرتا...ان میں کوئی کسی کا دوست نہیں، کوئی رقیب نہیں..رقابت ہے تو حسد آمدن کی نہ کہ رشک فن کی..جس کی جتنی پہنچ ہے وہ اُتنا بڑا ادیب ہے..نئی پود کے تئیں سرد مہری آنے والے کل کے لئے سم قاتل ثابت ہو رہی ہے.. ''من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو'' کی ایک اندھی دوڑ کا تماشا چل رہا ہے اور میں خاموش تماشائی بننا نہیں چاہتا.......(اپنی آپ بیتی ''سلگتے چنار'' سے)

سورج کا پہلا اندھیرا

کبھی کبھار زندگی کی موجودہ بے چینیوں اور خاموشیوں کے درمیان یادوں کے کالے اُجلے سکرین پر لاتعداد چینلز میں سے کسی ایک چینل پر اپنی بھولی بسری کہانی کا عکس نظر آتا ہے۔ ہاتھ ریموٹ کنٹرول پر رُک جاتے ہیں اور سکرین پر ایک خوبرو نوجوان نہایت ہی معصومیت سے پروگرام کا آغاز کرتا ہے۔ یہ نوجوان کون ہے، شکل و صورت جانی پہچانی لگتی ہے۔ میں اس نوجوان سے اپنی شناسائی کا لمحہ تلاش کرنے لگتا ہوں اور پھر اچانک کچھ یاد آتے ہی کمرے میں رکھے اپنے فوٹو البم میں قید چہروں کی بھیڑ میں کھو جاتا ہوں، کالے گورے، دمکتے، مرجھائے، نورانی، پژمردہ، ہنستے، روتے، بیگانے، دیوانے چہروں کے درمیان مجھے اُس معصوم چہرے کی تلاش ہے۔ یہ چہرہ کسی بھیڑ میں یا تو کھو گیا ہے یا پھر کیا معلوم پیروں تلے کچلا گیا ہو۔ کس کو الزام دیں سبھی تو اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں اندھی دوڑ دوڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔

میری تلاش کا دھاگہ نہیں ٹوٹتا۔ میں اُس چہرے کا ایک کالا سفید زردی مائل فوٹو تلاش کر ہی لیتا ہوں۔ ہاں یہ اُسی نوجوان کی تصویر ہے۔ ایک خوبصورت سا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ دور اُس خوبصورت پہاڑی پر واقع ایک ولی خدا کی درگاہ

کا دلنشیں منظر نگاہوں تلے آجاتا ہے اور میں اُس نوجوان کے ساتھ قمیض پاجامے میں ملبوس جیب میں پڑے سکوں کی تال پر جھومتا ہوا اُس پہاڑی کی بلندیوں کو عبور کرنے کی سعی کرتا ہوا نظر آتا ہوں۔ نہ کسی تھکن کا احساس اور نہ ہی سانس پھولنے کا ڈر لیکن جب پہاڑی پر واقع بادام کے شگوفوں کی خوشبو سے مہکتی ہوئی ''بادام واری'' قریب آنے لگتی ہے تو اچانک ٹی وی کے سکرین پر اندھیرا چھا جاتا ہے شاید کیبل نٹ ورک کے سگنل میں کوئی رکاوٹ آگئی ہو۔ کچھ لمحے، کچھ دن یا شائید۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ کچھ سال بیت گئے، خدا خدا کر کے سگنل اپنی پوری جوبن پر پھر برقی رو کی مانند تاروں میں دوڑتی ہوئی میرے اُداس کمرے کے ٹی وی سکرین تک پہونچ گئی۔ سکرین پھر جگمگا اُٹھا لیکن اب نگاہوں کے سامنے ''بادام واری'' نہ تھی۔ نہ وہاں کے بادام کے درخت اور نہ ہی وہ خوبصورت شگوفے۔ مجھے شک سا ہونے لگا کہ شائد سکرین پر کوئی انجانا منظر دکھایا جا رہا ہے لیکن جوں جوں وہ منظر ''زوم ان'' ہوتا گیا مجھے بادام واری کے ''کھنڈرات'' نظر آنے لگے۔ اب وہاں ''اگنی ریکھا'' کی حصار ہے جسکے آگے ''داخل ہونا منع ہے'' کیونکہ تواریخ گواہ ہے کہ اس لکیر کے آس پاس راون رہتا ہے اور شائید اسی لئے اب ہر سو عالم نیا نیا ہے اور اب ٹی وی پر بھی ایک نیا ہی منظر تھا۔

میں یا وہ جو سکرین پر جلوہ گر تھا اب ڈل جھیل کے کنارے بیٹھا مونگ پھلیاں کھا رہا تھا۔ اس الیکٹرانک دور کا یہ رنگ بھی بڑا عجیب ہے۔ یہاں پلک جھپکتے ہی منظر بدل جاتے ہیں کہاں ہمارے قصبے کی وہ خوبصورت پہاڑی جس کے دامن میں کبھی اپنائیت کے شگوفے کھِلا کرتے تھے اور کہاں یہ جھیل ڈل جو دن بدن سکڑ کر اب ایک نکتہ بنتی جا رہی ہے۔ کیا معلوم کسی دن یہ بھی ایک بستی یا گوالف کورس بن جائے کیونکہ جہلم میں اب کافی پانی

یا پھر شاید خون بہہ چکا ہے۔ ہماری اُس خوبصورت پہاڑی کے دامن میں واقع قبرستان بھی اب دن بدن وسیع ہوتا جارہا ہے۔ کیا معلوم ان قبروں کے اندر کتنے معصوم دفن ہونگے۔ سب کا تو ڈی این اے ٹیسٹ نہیں ہوتا۔ ویسے بھی ان قبروں نے متعدد سخن ور اور مٹی کے لال اپنے اندر جذب کر دئے ہیں۔ اکثر مونگ پھلیاں بھی قبروں کی طرح ہوتی ہیں جذبات اور احساسات کی قبریں، بہت ساری مونگ پھلیاں کھوکھلی تھیں۔ شاید اُنہیں بھی زمانے کی ہوا لگ چکی تھی۔ بڑی گرم ہوا ہے۔ سُنا ہے قحط الرجال کے پرندے کھیتوں کے اُوپر سے اُڑان بھر رہے ہیں لیکن ڈل جھیل کے کنارے لوگ ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ سیاح تو اب اپنے اپنے ممالک کے احکامات پر سر خم کر چکے ہیں بھلا جنگی جنون میں وہ اپنی گوری چمڑیوں کو کیوں کالا کریں۔ میں بھی اُن لوگوں میں سے ایک ہوں جنہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہے کہ بارشیں کب کی روٹھ چکی ہیں۔

میں شاید زیادہ مونگ پھلیاں کھا چکا تھا اسلئے مجھے پیاس لگنے لگی۔ دو گھونٹ پانی کے لئے مجھے اب بہت دور جانا پڑے گا۔ دن تو اب ڈھلنے لگا ہے۔ مجھے پانی خرید کے پینا ہے کیونکہ اب ہمارے یہاں بھی میزل واٹر کا چلن عام ہونے لگا ہے۔ چشمہ شاہی کے پانی پر پہرے لگ چکے ہیں۔ ہر کوئی خصوصی اجازت نامہ حاصل تو نہیں کر سکتا۔ اب تو یہ بات بھی مجبوری کہلائی جارہی ہے کہ دریا سوکھ رہے ہیں۔ اب پانی بھی شاید ایمپورٹ ہوگا یا پھر اسے بھی راشن کی دکانوں کے باہر لمبی قطاروں میں گھنٹوں کھڑے ہو کر بلیک میں خریدنا پڑے گا۔ اس وقت مجھے پیاس لگ رہی ہے لیکن اب بازار بھی تو شام ڈھلنے سے پہلے ہی بند ہوتے ہیں اور پھر اب نہ جانے کتنی بار اپنی جیب سے

اپنا چہرا نکال کر دکھانا پڑے گا۔ کتنی بار اپنا نام دہرانا پڑے گا۔ اب تو اپنا چہرا اور اپنا نام بھی پرایا لگنے لگا ہے۔ آخر میں کس چہرے کا امین ہوں۔ میری شناخت کہاں کھوگئی ہے۔ اس اُلجھن سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی طریقہ ہے ، مجھے ٹی وی کا چینل بدل دینا چاہئے۔ میں نے جوں ہی چینل بدل دیا سکرین کے ایک نئے طلسماتی منظر نے مجھے اپنا اسیر بنا دیا۔

ایک نامور شخصیت زوردار بھاشن دے رہی تھی۔ اُسے ہر ایک سے ہمدردی تھی۔ اُسکے دل میں ہر ایک کے لئے دکھ تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے کیونکہ اُسے وہی کچھ بولنا آتا ہے جو اُسکے سامنے رکھے کاغذ پر لکھا ہوتا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ وہ کیا بولتا ہے۔ اصلی بات تو وہ تب بولتا ہے جب ٹی وی کا کیمرہ آن نہیں ہوتا تب صرف ''اپنے'' سنتے ہیں جنہیں ظاہری اور خفیہ ایجنڈوں کا بخوبی علم ہوتا ہے اب بھلا جنتا کا دل بہلانے میں کون سا سرمایہ لگتا ہے۔ سرمائے کی بات تو بجٹ بولتا ہے ٹیکس لگا کے۔۔۔ خیر وہ خبروں کا قصہ ہے، جب خبریں ٹیلی کاسٹ ہونگی تب دیکھا جائے گا۔ ویسے اب اخبار بھی بہت زیادہ چھپنے لگے ہیں۔ کچھ اشتہارات کا پلندہ بنے ہیں اور کچھ صرف ایک اشتہار، اشتہارات تو اب ٹی وی پہ بھی بہت سارے آنے لگے ہیں۔ اصلی بات کا وجود تو اُن اشتہارات کی بھیڑ میں کُچلا جاتا ہے۔ ادھر جب میرے ٹی وی کے سکرین پر بھی اشتہار آنے لگا تو مجھے ایک سگریٹ پھونکنے کی مہلت مل گئی۔ حالانکہ ابھی ابھی میں نے ایک سگریٹ کو ایش ٹرے کی قبر میں دفن کر دیا ہے۔ اس موت کی رفتار بھی زمانے کے ساتھ تیز ہوگئی ہے۔ اب تو ایک ایک دن میں دس دس بیس بیس مرتے ہیں۔ اخبار کا ہاکر بھی جو اخبار تھما دیتا ہے وہ اس شعر کا مفہوم لے کر وارد ہوتا ہے کہ:

اک اندھیری شب میں کس نے کر دئے چھلنی حروف
زندگی اخبار کی مانند لہو میں تر ہوئی

اُسدن تو زیادہ ہی قہر مچ گیا جب کسی زمینی سانحے یا حادثے کے ساتھ نمٹنے کے لئے تمام محافظوں کو چوکس کر دیا گیا تھا لیکن ''آسمانی حادثے'' نے ایک لاکھ لوگوں کو موت کی آغوش میں سُلا دیا لیکن ملبے سے ابھی پوری لاشیں بھی نہ نکالی گئی تھیں۔ میتوں پر ابھی ماتم کی چادر بچھائی ہی نہیں گئی تھی کہ ''خاک اور خون'' کا ایک نیا تماشہ منظر عام پر آ گیا کہتے ہیں وہاں موت بھی دہشت زدہ ہو کر ایک جلتے تنور میں کود پڑی۔ ہماری وادی میں لل دید تنور میں کودی تھی امر ہونے کے لئے۔ اُدھر کسی کو مارنے کے لئے تنور کی آگ بھڑکائی جا رہی تھی۔۔ خیر اب زخموں کی بھی سالگرہ منائی جا رہی ہے۔۔ سرخیوں میں لکھا ہے دو چار دن کا ماتم کرو اور بھول جاو کیونکہ بھول جانا انسان کی خمیر میں ہے۔ سرخیاں پہلے سرخیاں ہوتیں تھیں اب ان پر بھی کئی رنگ چڑھے ہیں۔ آخر سیاست کے اشتہار تو رنگین ہی ہوا کرتے۔ ہیں نا؟۔ اب ٹی وی کے سکرین پر کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ یا تو سگنل پھر سے کمزور ہو گئی تھی یا پھر میری آنکھوں میں بے وجہ آنسو آ گئے تھے۔ لگتا ہے اب مجھے اپنی نگاہوں کو کسی عینک کا سہارا دینا پڑے گا لیکن دھند تو اب ہر دن بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اب تو دن کو بھی روشنی کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اندھیرے آسمان سے اُتر چکے ہیں اور اب وہ دن کو بھی واپس جانے کا نام نہیں لیتے۔ سنا ہے روشنی کے ذخائر بھی اب کم ہونے لگے ہیں، ایسے میں اندھیروں کا راج تو قایم ہی رہے گا بھلے ہی شاہی محل تک پہونچنے کے لئے سیاسی چہروں کا لہجہ بھی بدلے اور انداز بھی۔

میں اس سیاسی ڈرامہ کے بجائے کوئی ٹی وی ڈرامہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں چینل بدل دیتا میرے صحن میں شور مچاتا ہوا جنریٹر آخری بار چلا کر خاموش ہو گیا۔ کمرے اور ٹی وی سکرین پر اندھیرا چھا گیا۔ میں نے کمرے میں سوئے بچوں اور محو خواب بیوی پر ایک نظر ڈالی اور ٹی وی کا سوئچ آف کیئے بنا لحاف اوڑھے اپنے بستر میں دبک گیا۔ کیا معلوم کل کا سورج پھر کون سا اندھیرا لے کر آئے۔ ☆☆

لمحے کا سفر

جب وہ گھنٹہ گھر تعمیر کیا گیا تھا تب ''اکبر جو'' اپنی سرکاری نوکری کے آخری سال میں تھا۔ اُسکے دفتر میں بھی اکثر لوگ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے تھے کہ لیڈر لوگ یہ سب کچھ اپنی پبلسٹی کے لئے کرتے ہیں۔ کارنامے انجام نہیں دیئے جاتے۔ فنڈس میں ہیرا پھیری عروج پر ہے لیکن شہر کے مین چوک کے وسط میں ایک ''ماڈرن گھنٹہ گھر'' تعمیر کرکے ''حاتم'' کی قبر میں سرسراہٹ پیدا کی جارہی ہے۔

اُسدن ٹھیک دن کے بارہ بجے تھے جب نہایت ہی کروفر کیساتھ ''حاکم وقت'' کا کارواں اُس مقام تک آیا تھا۔ گھنٹہ گھر کو مختلف رنگوں کی ڈیوڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ اکثر دیکھنے والوں کو گھنٹہ گھر کی بجائے ڈیوڈیاں اور لیڈر کے لئے تیار کیا گیا بلند و بالا آسمان کو چھوتا ہوا سٹیج ہی نظر آرہا تھا۔ پریس والوں کے ڈیجیٹل کیمرا ابھی اُس گھنٹہ گھر کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ لیکن جب لیڈر اپنے وقت سے ایک گھنٹہ لیٹ آنے کے باوجود جلوہ گر ہوا تو کیمرا کے ساتھ ساتھ ہر ذی حس کی آنکھ اُس کے ہی کلوز اپ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ لوگوں کا ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر گھنٹہ گھر پر لگی ہوئی

خوبصورت گھڑی کو ''وقت کا سفر'' شروع کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے بے تاب تھا لیکن اُن سوئیوں کی حرکت یا تو لیڈر نے دیکھی یا پھر اُس کے کمانڈوز نے۔ عام لوگوں کو دوسرے دن سے پتہ چلا کہ واقعی گھنٹہ گھر کی وہ گھڑی اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ اور یوں لوگوں کی عام وخاص گھڑیوں کے ساتھ ساتھ اکبر جو بھی اپنی نوکری کے آخری ایام میں اپنی پرانی سی گھڑی کا وقت اُس گھنٹہ گھر کی گھڑی کے ساتھ ملاتا رہا۔ تب تک جب تک وہ باضابطہ طور ریٹائر نہیں ہوا۔

پھر وہ ہوا جو تواریخ کے پرانے، زردی مایل صفحوں میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ ایکدن گھنٹہ گھر کی یہ گھڑی اچانک رُک گئی۔ لوگوں کے لئے یہ بات عام سی تھی لیکن اکبر جو کے گھر میں اُسی دن ایک بھونچال آ گیا۔ صبح سویرے اخباری ہاکر چلا چلا کر جو شہ سرخی بیان کر رہے تھے اُس کا ایک ایک لفظ اکبر جو کے جسم وجگر کو چھلنی کر رہا تھا۔ شہر کے اُس چوراہے پر اُس رات ایک آدمی کا خون ہوا تھا۔ لاش صبح کو پولیس والے لے گئے تھے اور پھر مقتول کے وارثین، لیکن کہتے ہیں رات بھر کتے اُس کا خون چاٹتے رہ گئے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ کتے اُس لاش کے کپڑوں کو بھی دانتوں سے ادھیڑنے کا ارادہ کر چکے تھے لیکن بھلا ہو اُن کی حیوانیت کا کہ وہ تب تک آپس میں گتھم گتھا ہو گئے جب تک موذن نے فجر کی اذان نہ دی اور یوں ایک خاکروب نے اُس لاش کو پہلی بار دیکھا اور پھر جب تک اُس کی شناخت کا مرحلہ آیا تب تک اکبر جو کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔ اُس کے گھر اُسکے جوان اکلوتے بیٹے کی لاش پہونچ چکی تھی۔

اس واقعے کا چرچا کئی دنوں تک رہا۔ لواحقین کے گھر میں بھی ماتم چار دن تک ہوا اور لوگ پھر زندگی کے سفر میں گم ہو گئے۔ پورے شہر کے لئے اس گھنٹہ گھر کی گھڑی کا

بند ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ہر کوئی اپنے حساب سے اپنے وقت پہ چلتا ہے۔ دوسرے کی گھڑی ہو یا گھنٹہ گھر کی گھڑی یہ سب تب اپنا احساس دلاتی ہیں جب اپنی گھڑی کی سوئیاں تھک جاتی ہیں۔ لیکن۔۔۔۔

کسی کو وقت کا احساس ہو یا نہ ہو۔ وقت اپنا احساس دلا ہی دیتا ہے۔ ایکدن یہ خبر پورے شہر میں گردش کرنے لگی۔ اخبارات کی شہہ سرخیوں نے بھی اسے اپنی پلکوں پر بٹھایا۔ مذہبی۔ سیاسی اور سماجی انجمنوں میں یہ بات موضوع بحث بن گئی کہ گھنٹہ گھر کی گھڑی بند ہوگئی ہے۔ کچھ انجمنوں نے حکومت کو بھی ہدف تنقید بنایا۔ اسمبلی کے ایوان میں بھی گھنٹہ گھر کی گھڑی نے اپنی اہمیت کا گھنٹہ بجایا لیکن۔ مختلف غیر سرکاری اور سرکاری جماعتوں کی جانب سے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے باوجود اُس گھڑی کی عملا کوئی مدد نہ کی جاسکی۔ اُسکی دونوں سوئیاں بارہ بجے رات سے ایک لمحہ قبل اپنی موت کا اعلان کرچکی تھیں یا پھر ہاتھ جوڑ کر معافی کی خواستگار دکھائی دے رہی تھیں۔ افسوس اس بات کا تھا گھڑی کی دھڑکنیں اُس رات اپنے بارہ گھنٹے بجانے سے پہلے ہی بند ہوگئیں تھیں۔ اُس رات کسی نے اُس گھڑی کی آخری چیخ بھی نہیں سُنی تھی۔

وقت کا یہ مرہم بھی عجیب ہے کہ وہ بڑے بڑے زخموں کا مداوا کرتا ہے۔ ایک دہائی گذر گئی۔ وقت نے ہزاروں کروٹیں لی۔ سماجی۔ سیاسی۔ اور مذہبی جماعتوں کے کئی قایٔد منوں مٹی تلے دفن بھی ہوگئے بلکل اُسی طرح جس طرح یہ گھنٹہ گھر کی گھڑی کا معاملہ بھی دفن ہوگیا۔ پہلے پہلے تو اُس شاہراہ پر چلنے والے لوگ اُس بند گھڑی کی طرف غیر ارادی طور پر دیکھتے تھے لیکن اب اُس جانب دیکھنے کی عادت بھی یادِ رفتہ ہوگئی تھی۔ پورے شہر میں جیسے اُس گھڑی کی اہمیت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ سماجی لیڈروں کے

سامنے نت نئے مسائل اپنی تازگی کا احساس دلا رہے تھے۔ مذہبی لوگوں کو اپنے اختلافات کا سد باب تلاش کرنے سے فرصت نہیں تھی۔ اور سیاسی بحران نے ایک ''نئی شکل'' اختیار کر کے سب کچھ اُلٹ پلٹ کر دیا تھا۔ اب ایسے میں کس کے پاس اتنی فرصت تھی کہ وہ ایک گھنٹہ گھر کی گھڑی کو ٹھیک کرنے کی ''فضول'' سی سوچ کو اپنے ذہن و دل میں جگہ دے دیتا۔ لے دے کے بس وہ بوڑھا اکبر جو تھا۔ جس کے بیٹے کی لاش کے خون کو رات بھر کُتے اسی گھنٹہ گھر کے سامنے چاٹ چکے تھے۔ وہ آج بھی ہر جمعہ کو قریب کی ایک مسجد سے نماز پڑھنے کے بعد اُس گھنٹہ گھر کی فلک بوس عمارت کے سامنے آ کر رُک جاتا۔ اُسکی پُرنم آنکھوں میں ایک ہی سوال موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا

''اے گھڑی کیا تم نے اُن قاتلوں کو دیکھا ہے؟''

لیکن گھڑی اُس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے پاتی۔ وہ آج بھی ہاتھ جوڑ کر جیسے اپنی بے زبانی یا پھر اپنی بے بسی اور بزدلی کے لئے معافی مانگتی۔ اور بوڑھا ہر ہفتے ایک نئی آس لئے اُس گھنٹہ گھر کے سامنے ایستادہ ہو جاتا کہ شاید اب کے کوئی 'معجزہ' ہو اور وہ گھڑی کچھ بول سکے۔ لیکن کتابوں میں لکھا ہے اور کتابوں کا لکھا ہی سچ ہوتا ہے کہ ''اب معجزے نہیں ہوا کرتے'' کیونکہ ''معجزوں کا موسم'' کب کا گذر چکا ہے۔

اس بات کا احساس بوڑھے شخص کو بھی تھا۔ پھر بھی وہ محلے کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کی بجائے گھنٹہ گھر کے قریب ایک جامع مسجد میں سر جھکانے آتا تھا کیونکہ ہر جمعہ کی صبح کو جب وہ اپنی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے اپنی تنہائی اور بے بسی کی مورت اپنی فالج زدہ بوڑھی بیوی کو دیکھتا تھا تو اُسے اپنا سہارا یاد آتا تھا جو جمعہ کے روز ہی گھر سے نکل کر ماں کے لئے دوائیوں کا انتظام کرنے گیا تھا۔ لیکن نہ دوائیاں آئیں، نہ بیٹا اور نہ ہی

بوڑھے کی بیوی کو موت ہی آئی۔ بیچاری اپنے بیٹے کے آنے کی اُمید میں ایسے ہی بستر پر بے حس وحرکت پڑی رہتی تھی۔ دروازے کی جانب آنکھیں بچھائیے۔ بدنصیب کو کسی نے اتنے سالوں تک یہ خبر بھی تو نہیں سنائی تھی کہ اُس کا بیٹا اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔ خود اُس کا اپنا شوہر بھی تو اس معاملے میں گھنٹہ گھر کی گھڑی کی طرح سچ کہنے کی جسارت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس لئے شاید وہ ہر جمعہ کو اُس علاقے میں آ کر ایک ''سچ'' کی تلاش کرتا تھا۔لیکن ۔۔۔

''سچ'' تو اب شہر کے وسیع وعریض قبرستان کو پُر کرتا ہوا شہر و گام کے میدانوں میں بھی دفن ہو چکا تھا۔ ایسے میں بھلا ایک بوڑھے، نحیف، بے سہارا شخص کو بھلا ''سچ'' نظر آتا تو کہاں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن بوڑھے کی فالج زدہ بیوی کی آنکھوں میں اُمید کے چراغ گُل ہو گئے اور پھر بوڑھے کے کانپتے قدموں، تھرتھراتے ہاتھوں اور پُرنم آنکھوں نے اُسے کفن میں لپیٹ کر جمعہ نماز سے پہلے ہی اپنے آخری سفر کے پہلے پڑاو تک پہونچا دیا۔ ایک جانب بوڑھے کے دل پر عمر بھر کے ساتھی کی جدائی کا غم پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑا تھا لیکن دوسری جانب اُسے کم از کم یہ اُمید تو تھی کہ اب ایک ماں کا لمبا انتظار ختم ہو چکا ہوگا کیونکہ اب وہ اپنے بیٹے کے پاس پہونچ چکی ہوگی۔

اس واقعے کو بھی ایک سال گذر گیا یعنی گھنٹہ گھر کی گھڑی کو اب بند ہوئے پورے بارہ سال ہو چکے تھے۔ ان بارہ سالوں میں نہ جانے کتنی زوردار بارشیں آسمان کا سینہ چیرتی ہوئی زمیں کی چھاتی کو پھاڑنے کی سعی کرتی رہیں۔ کتنی بار تیز وتند ہواؤں نے شہر کی لاتعداد چھتوں کو جہلم کے سوکھے قبرستان میں دفن کر دیا لیکن گھنٹہ گھر کی گھڑی کے دونوں بازو ایک دوسرے کے ساتھ تقریباً ملے ہوئے اب بھی اپنے اُس ایک لمحے کا سفر

طے کرنے سے قاصر تھے۔ اب تو وہ بوڑھا بھی ایک ''سچ'' کی تلاش میں وہاں نہیں آتا تھا۔ اُسکے پاس پڑوسی کہتے ہیں کہ اب وہ محلّے کی مسجد پر جانے کے قابل بھی نہیں رہا ہے کیونکہ اُسکی پُرنم آنکھیں اب بے نور ہوگئی تھیں۔ وہ اب اپنے حجرے کے ایک کونے میں کسی فرد کی مزاج پرسی کو آنا ہی اپنا مقدر سمجھ چکا تھا۔ حالانکہ آنے والے بھی اب اپنے غم دوراں کے افکار میں یوں الجھے تھے کہ اُنہیں خود اپنے گھروں کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں ایک معصوم دیا جلانے کی بھی جسارت نہیں ہوتی تھی۔

یہی حال لگ بھگ اُس گھنٹہ گھر کی گھڑی کا بھی تھا۔ فلک بوس عمارت کے ماتھے پر لگے ہوئے ایک داغدار چاند کی مانند وہ گھڑی خود اپنے گرہن کی سالگرہ پر سالگرہ مناتی گئی تنہا تنہا۔ لیکن۔۔۔۔ ایک دن۔۔۔۔

وہ سب کچھ جیسے ایک معجزے کی طرح اچانک ہوگیا۔ سارا شہر اُس سرد برفیلی رات کے سنّاٹے میں اپنی اپنی نیند میں ہڑبڑا کے جاگ پڑا۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی اچانک اپنا وہ ایک لمحہ طے کر کے پورے بارہ گھنٹے بجا رہی تھی۔ اپنی پوری آواز کے ساتھ۔

دوسرے دن لگ بھگ سارا شہر یہ دیکھنے کے لئے گھنٹہ گھر کے آس پاس اُمنڈ آیا کہ آخر گھنٹہ گھر کی گھڑی خود بخود کیسے ٹھیک ہوگئی ؟

سب کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا۔ ''آخر یہ سب کیسے ہوا ؟'' لیکن اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ گھڑی بلاشبہ اپنے پورے جوش کے ساتھ وقت کی رفتار تھام چکی تھی۔ اُسکے ساتھ ساتھ جیسے سارا شہر بھی متحرک ہو چکا تھا۔ لیکن کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا کہ آخر اس گھڑی کے دل کو کس نے پھر سے دھڑکنیں عطا کیں۔

شام ہوتے ہی لگ بھگ ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات کے ایوننگ ایڈیشنز میں اپنے

اس واحد سوال کا جواب تلاش کرنے لگے لیکن اب کی بار نہ کسی ٹی وی چینل نے اس بارے میں کوئی فلش ہی منسہ شہود پر لایا اور نہ کسی اخبار نے اس نوعیت کی کوئی شہہ سرخی ہی صفحہ قرطاس کی زینت بنادی۔

دوسرے دن لوگوں کے چہرے مایوسی کے اندھیروں میں لپٹے ہوئے نظر آرہے تھے کیونکہ ایک سنسنی خیز بات کا راز ہنوز وقت کے دبیز پردوں میں چھپا تھا۔ اور گھنٹہ گھر کی گھڑی کا صحیح وقت تو جیسے پورے شہر کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ آج وہ گرہن زدہ چاند جیسے مسکرا رہا تھا۔ اپنی طرف دیکھنے والوں کو اپنی ٹِک ٹِک سے اپنی زندگی کا وہ راگ سنا رہا تھا جس راگ کو اس شہر کے سارے لوگ برسوں سے بھول گئے تھے۔ لیکن لوگوں کو اب اس راگ سے زیادہ اس راگ کے سروں میں چھپے راز کو سرِ عام عریاں دیکھنے کی تمنا تھی اور جب یہ بات نابینا بوڑھے کے کانوں تک بھی پہونچی تو وہ بھی گرتا پڑتا اپنی دہلیز تک آیا۔ وہ بار بار اپنے آس پاس کے لوگوں سے ایک ہی التجا کر رہا تھا کہ وہ بھی اُس ٹِک ٹک کرتی ہوئی گھڑی کے قریب جانا چاہتا ہے۔ لوگ اُسکی التجا کو اَن سنی کر رہے تھے جیسے اُن سبھوں کی آنکھیں تو تھیں لیکن اُن کے کانوں کے پردوں میں کسی نابینا کے الفاظ کوئی ارتعاش پیدا نہیں کر رہے تھے۔

بوڑھا اپنے ہاتھ آگے پھسار کر گویا اپنی التجا کی جھولی پھیلا کر ملتمس تھا

''بھائی اندھا ہوں تو کیا ہوا۔ کانوں سے تو وقت کی آواز سننا چاہتا ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے اُس گھنٹہ گھر تک لے جاؤ''

لیکن کسی نے بوڑھے کی خالی جھولی میں ہمدردی کے دو بول بھی نہ ڈالے۔

بلآخر وہ خود اپنی پینشن کے چند سکوں سے ایک آٹو والے کو گھنٹہ گھر تک چلنے پر

آمادہ کر سکا۔ گھنٹہ گھر کے پاس دور دیہات سے آئے ہوئے لوگوں کا اژدھام بھی بڑھنے لگا تھا۔ بوڑھا آٹو میں ہی بڑے انہماک کے ساتھ کان لگائے گھڑی کی ٹِک ٹِک سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسکے دل میں اب ایک ''نیا سچ'' جاننے کی طلب انگڑائیاں لے رہی تھی ۔ بڑھتے ہوئے جم غفیر کو دیکھ کر آٹو والے کو اپنے آٹو کی فکر ستانے لگی اور جوں ہی اُسنے بوڑھے سے واپس چلنے کے لئے کہنا چاہا تو اُسے یوں لگا جیسے بوڑھے نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر پھر سے دیکھنا شروع کر دیا ہو۔ وہ سچ مچ ویسے ہی اُس ٹِک ٹِک کرتی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھ رہا تھا جیسے عام چشم بینا رکھنے والے لوگ اُس گھڑی کو دیکھ رہے تھے۔ بوڑھا دھیرے دھیرے زیرلب مسکرا کے کچھ بڑ بڑا رہا تھا۔ آٹو ڈرائیور نے حیرت زدہ ہو کر بوڑھے کے لبوں کے قریب اپنے کان لے جانے کی سعی کی لیکن اسی اثنا میں ایک اخباری ہاکر زور زور سے تازہ ترین اخبار کی ایک شہہ سرخی چلاّ چلاّ کر بیان کرتا ہوا وہاں سے گذر گیا۔

''پڑھیے آج کی تازہ خبر۔ کل رات ایک لاوارث پنڈت کا انتم سنسکار اُسکے ہمسایہ مسلمان بھائیوں نے ادا کیا۔ پڑھیے آج کا تازہ پرچہ''

اکبر جو اپنی سیٹ پر زیرلب مسکراتے ہوئے دم توڑ چکا تھا ☆☆

باسی روٹی

اُس سرد برفیلی رات کو جب خاموشی کے جھونکے میرے گھر کی بند کھڑکیوں پر اپنی موجودگی کے ذرّات بکھیر رہے تھے مجھے رات کے سنّاٹے میں گھر کے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سنائی دی۔ میں اُس وقت ٹیلی فون کے پاس بیٹھا کسی تازہ ترین واردات کا منتظر تھا، جسکی خبر بنا کر میں اخبار کو ارسال کر دیتا۔ لیکن یہ بے وقت اور اجنبی سی دستک۔۔ مجھے اپنا قلم روک کر دروازے کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ دروازے پر اب بھی کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں ایک تازہ ترین خبر کی اُمید پر عجلت کے ساتھ دروازے تک پہونچا لیکن باہر سرد یخ بستہ ہواؤں کے سوا کچھ نہ پا کر میں خود اپنے آپ پر برس پڑا کہ اچانک میرے کانوں میں جیسے کسی کی سرگوشی اُبھرنے لگی

''بابو جی میں گلبدن ہوں ،گلبدن۔۔۔کیا آپ بھی مجھے بھول گئے؟۔آپ جسے میری کہانی برسوں روٹی کھلاتی رہی ہے''

میں چونک پڑا، یا شاید وہ ڈر کا ایک شدید جھٹکا تھا جو مجھے برقی رو کی طرح چھو کے گذر گیا۔ میرے دالان پر اب بھی نیم تاریکی کے سایوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ سرگوشی مجھے اپنی نبض رُکتی ہوئی محسوس ہوئی اور چند لمحوں کے بعد مجھے یوں لگا جیسے ایک

انجانی قوت مجھے اپنے رائیٹنگ ٹیبل پر لاکر گلبدن کی بھولی بسری کہانی کو اُسکے منطقی انجام تک لانے کی ترغیب دینے لگی۔ اُس رات میں ایک پل بھی نہ سو سکا۔

گلبدن دور پہاڑی گاوں سے اُتری کوئی پری، جسے ایک نظر دیکھنے کے بعد اُس کے سراپا سے نظریں ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ وہ تھی بھی حسن کی ایک بے مثال مورت۔ سبز رنگ کا فرن پہنے، اُس کا برفیلے دودھیا پانی سے نہایا ہوا مرمریں بدن، اسکے لباس پر رنگ برنگے پھول، جیسے کائینات کے ہر رنگ کی خواہش کا احترام کر رہے ہوں۔ اُس کے ماتھے پر سجا ہوا چاندی کا وہ ٹیکہ جیسے کسی مقدس جگہ پر جلتا ہوا چراغ۔ اُسنے اپنی زلفوں کے بادل اپنے آنچل میں چھپانے کی کوشش تو کی تھی لیکن ایک آوارہ لٹ اُسکے ماتھے پر بار بار اپنی بے تابی کا اظہار کر رہی تھی۔ اُسکی مرمریں بانہوں میں ہیرے جیسے چمکتے چاندی کے کنگن کبھی کبھار یوں بج اُٹھتے تھے جیسے دور چاندنی رات میں کوئی اپنے کسی محبوب کو اشارہ کر رہا ہو۔ اُسکی چال بھی ہواؤں کو شرمندہ کر رہی تھی لیکن وہ ان تمام نزاکتوں کے باوجود اپنے مقدر میں سکھ کا ایک سانس بھی نہ لائی تھی اور اسی لئے وہ آج میرے شہر کی ایک عدالت میں حاضر ہو رہی تھی۔

وہ عدالت میں داخل کیا ہو گئی ہر ایک اپنی جگہ پہ ساکت ہو گیا۔ ہر سانس میں شگفتگی کا احساس مہکنے لگا لیکن ایک آدھے ادھورے گھونگھٹ تلے آنسوؤں کی مالا کوئی نہ دیکھ پایا۔ ماہتاب کا بے پناہ حسن سب کو تو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا لیکن چاند کے اُس اندھیرے سفر کا کسی کو احساس بھی نہ ہوا جس نے اُسے عدالت کے سامنے ایک بے بس مورت کی مانند لا کھڑا کر دیا تھا۔ میں خود اپنے پیشہ وارانہ فرائیض کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک دلچسپ مقدمے کی روئیداد سننے کے لئے عدالت میں موجود تھا۔ مجھے ایک دلچسپ

اور سنسنی خیز مواد کی تلاش تھی کیونکہ ایسی ہی کہانیوں سے میرے گھر کی بہت ساری کہانیاں اپنے انجام کو پہونچتی ہیں۔ میں قلم کاغذ تھامے ہمہ تن گوش تھا۔

گویائی اور سماعت کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ اُسکی کھنکتی آواز نے ہر ایک کے دروازے پر جب دستک دینی شروع کی تو ہر ایک کے ذہن میں جیسے ایک شور سا اُٹھنے لگا۔ مجھے بھی اپنے اندر ایک طلاطم اُٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

''مائی باپ۔ یہ دونوں مشٹنڈے میری تباہی کے ذمہ دار ہیں'' گُلبدن نے عدالت کے کٹہرے میں موجود دو گوجر نوجوانوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا

''اِنہوں نے مجھے اِس عدالت تک لانے میں شرم بھی محسوس نہیں کی سرکار''

کچھ لمحے اپنا پلو درست کرنے کے بعد وہ پھر بولنے لگی ''حضور یہ جبار خان ہے نا، اسنے میرے باپ کو بہلا پھسلا کر اپنی مٹھی میں تب جکڑ لیا تھا جب میں بہت چھوٹی تھی۔ اتنی سی'

اُس وقت کا قد دکھانے کے لئے جوں ہی گلبدن نے اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت دی تو بازوؤں کے کنگن ایسے بج اُٹھے جیسے شنکر آچاریہ کی پہاڑی پر گھڑیال بج رہے ہوں اور انصاف کے دیوتا کو آواز دے رہے ہوں۔

''مائی باپ! اس جبار خان نے اپنی برادری کے چار آدمیوں کے سامنے میرا نکاح لکھوایا، اُس وقت میں اپنی چھوٹی سی بہن کو گود میں سنبھال بھی نہ سکتی تھی۔ اُس کے چند مہینے بعد جب میرا باپ چل بسا تو جبار خان نے مجھے دُلہن بنانے کے خواب دیکھنے شروع کئے۔ یہ ایکدن مجھ سے ملا اور بولا'' دیکھو گلبدن! تم ہماری بن چکی ہو۔ اس لئے اپنے ساتھ اپنی ساری جائیداد، ریوڑ، زیور، سب کچھ لے کر ہماری بستی میں آنا۔ ہمارے قبیلے میں، یہاں اُن چیزوں کی رکھوالی کرنے والا کون رہا ہے''

مائی باپ میں نے معلوم کیا جواب دیا، میں نے کہا ''جبارا، تم نے میرے باپ کی گردن پر چھرا رکھ کے مجھے اور میرے بچپن کو قتل کر ہی دیا ہے لیکن اب میری گردن پر چھرا رکھ کر میری معصوم بہن کو بھوکوں مرنے پر مجبور مت کر دو۔ اور حضور میں نے اُسی دن اِسے اپنے قبیلے کے سامنے دُھتکارا لیکن اس کمینے نے وہ چال چلی مائی باپ کہ مجھے اسکے گھر جانا ہی پڑا اور یوں میں چھوٹی سی عمر میں ہی اسکے بچے کی ماں بن گئی۔ اس دوراں بھی اسکے دل و دماغ پر میری جائیداد گھومتی رہتی تھی لیکن جب بچہ پیدا ہونے کے بعد بھی میں نے اپنی کوئی چیز میکے سے نہیں لائی تو اس نے مجھے ایک اندھیری رات میں دھکے مار مار کر اپنے معصوم بچے کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے قبیلے میں واپس آئی اور پھر کچھ دنوں کے بعد مجھے یہ شخص ملا۔ یہ شریف خان، جسے میں بڑا شریف اور اپنا سچا ہمدرد سمجھتی تھی کیونکہ یہ اکثر مجھے تسلی دیا کرتا تھا۔ اِسنے اُسدن بھی میرے آنسو پونچھنے کی کوشش کی، میرے معصوم بچے کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسی کی بدولت میں اس جبار خان کے چنگل سے بھی آزاد ہوگئی اور یوں میں بے سہارا اکیلی عورت دھیرے دھیرے اِسکے خلوص کی احسان مند ہوتی گئی۔ میں بے بس تھی مائی باپ اور مجھے یوں لگا جیسے اُوپر والے نے شریفا کی صورت میں میرا ایک سہارا بھیجا ہو لیکن مائی باپ یہ شریفا بھی شریف ثابت نہ ہوا۔ اِس نے بھی میری عزت و آبرو کے ساتھ کھلواڑ کیا اِسنے نے بھی وہی کچھ کیا جو جبارا کرتا تھا۔ اِسکے دل میں ویسی ہی لالچ تھی جیسے جبارا کے دل میں تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ جبارا میرے مال و جائیداد پر اپنے گھر میں عیش کرنا چاہتا تھا جبکہ شریفا میرے ہی گھر میں گھر جمائی کی طرح رہ کر میرے ہی مال و جائیداد پر سانپ بن کے لوٹنا چاہتا تھا۔ مائی باپ یہ شریفا ظاہراً بڑا بھولا لگتا ہے لیکن اندر سے یہ بھی اس

جبار کی طرح بڑا عیار ہے حضور، بڑا عیار۔ میں اسکے خلوص کو دیکھ کر اِسکے نکاح میں آ گئی ہوں حضور لیکن اِسنے اپنے خلوص کے ایک ایک لمحے کی قیمت مجھ سے وصول کی ہے۔ یہ پچھلے کئی برسوں سے میرے ہی گھر میں رہ کر مفت کی روٹیاں توڑتا ہے۔ جس کو چاہے میری پشتنی زمین کا ٹکڑا بیچ کر اسکی ساری قیمت' ساری دولت ان شہروں میں آ کر لٹاتا ہے۔ اب آپ ہی بتائے مائی باپ میں ان دونوں میں سے کس کو اپنے دو معصوم بچے سونپ دوں۔ کس کے پلے اپنے آپ کو باندھ دوں۔ کس کے ظلم کی شکار بنتی رہوں''

سسکیوں کی آواز عدالت کے کمرے میں گونجنے لگی اور ہر ایک کی نظر جبار اور شریفا کے جھکے چہروں پر مرکوز ہوگئی۔

بیانات اور عدالتی تاریخوں کے اژدھے نے نہ جانے کتنی کروٹیں لیکر وقت کے ان گنت معصوم لمحوں کو نگل لیا، یہ بات تو اب میرے ذہن کے صفحوں پر بھی نظر نہیں آتی ہے کیونکہ میں باسی خبروں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ میں سنسنی خیز خبروں سے اپنے گھر کی دیواروں کو آراستہ کرتا ہوں۔ جو تصویر پرانی ہوئی اُسے کوڑے دان میں پھینک کر اپنے ذہن کی Recycle Bin کو ہلکا کر دیتا تھا۔ یہی تو اس Computerized age کا اصول ہے۔ یوں گلبدن کی یہ بھولی بسری کہانی بھی آہستہ آہستہ دیمک کی نذر ہوگئی لیکن آج نہ جانے کیوں مجھے گلبدن کی آہٹ نے دردِل پر دستک دے کر ماضی کے دھندلکوں میں دھکیل دیا تھا۔

دوسرے دن میں گلبدن کے قبیلے میں پہونچ چکا تھا۔ گلبدن کا مسکن مجھے ایک برسوں پرانی تصویر کی مانند کچھ زردی مایل رنگت لئے ایک زبوں حال کینواس سا لگا۔ گلبدن کے چھوٹے سے گوجر کوٹھے کے باہر دو ننگ دھڑنگ بچے۔ پھٹے حال کپڑوں میں

ملبوس ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔

''میں جبار خان کا بیٹا ہوں، جبار خان کا۔۔تم مجھے کسی حال میں نہیں ہرا سکتے۔ میں اس ساری جائیداد کا اصلی وارث ہوں'' ایک بچہ دوسرے بچے کا گریبان پکڑے ہوئے کسی فلمی ویلن کی طرح دھاڑ رہا تھا۔

''میں بھی شریف خان کا بیٹا ہوں، شریف خان کا۔جسنے تمہارے باپ کو ہرا کر میری ماں کو بھی جیت لیا ہے۔ یہ سب کچھ میرا ہے'' دوسرا بچہ اپنے آپ کو کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں سمجھتا تھا۔

''ارے رہنے دے رہنے دے۔ابھی کہاں جیتی ہے۔میرا باپ تو کہتا ہے ابھی کچہری میں مقدمہ جاری ہے''

مجھے ایک لمحے میں ہی ساری کہانی کا تانا بانا مل گیا۔کہانی اب بھی وہیں تھی جہاں برسوں پہلے میں نے اسے ایک کورٹ کے بند کمرے میں دیکھا تھا۔'' ہنہ، باسی کہانی۔۔۔'' میں خود سے بڑبڑا کر جوں ہی واپس مڑنے لگا، مجھے گوجر کوٹھے کے دروازے پر وہ نظر آئی۔وہی جو دور پہاڑی گاوں سے اُتری ہوئی کوئی پری لگتی تھی، جسے ایک نظر دیکھنے۔۔۔

لیکن۔۔۔میں تو اب اُسے ایک نظر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکا۔وہ ۔۔وہ کون تھی جو دروازے پر اپنا جسم اور چہرا ایک میلی کچیلی چادر سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی، گلبدنؔ یا اُسکی کوئی اُجڑی اور لُٹی ہوئی روح۔

مجھے جبار خان اور شریف خان پہ افسوس ہونے لگا۔کیا وہ اسی گرد آلودہ، بجھی بجھی، ویران گلبدنؔ کے لئے اتنے برسوں سے لڑ رہے ہیں جسے گلبدن کہنے کو بھی اب

دل تیار نہیں ہوتا۔ مین یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنے قریب اُسی لٹی ہوئی گلبدنؔ کی سرگوشی سنائی دی۔

''کیوں بابو، مجھ سے مل کر نہیں جاؤ گے۔ میرا حال نہیں دیکھو گے۔ تم تو تازہ ترین خبروں کے رسیا ہو۔ دیکھو میری جانب دیکھو۔ شریفا اور جبارا نے مل کر میرا کیا حال بنا دیا ہے۔ دونوں نے مل کر میرے ہی گھر میں، میرے ہی نام پر ایک دوسرے کو جلانے کے لئے وہ آگ لگا دی کہ میں ہی اُس میں جھلس کر رہ گئی'' گلبدن نے یہ کہتے ہوئے اپنے چہرے سے ذراسی چادر کیا سرکا دی کہ مجھے اُسکے ادھ جلے چہرے کو دیکھ کر اُبکائی آنے لگی۔ میں وہاں سے کھسکنے کی سعی کرنے لگا لیکن اسی لمحے گلبدنؔ کے ہیبت ناک چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھری اور وہ ایک اجنبی سے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''کیوں بابو میری کہانی میں کوئی تازگی نہیں ہے کیا۔ کم از کم میرے ان دو بچوں کی جانب تو دیکھ لو یہ تو میری خبر کو ہمیشہ تازہ رکھنے کا عہد کر چکے ہیں۔ میں جیسی بھی رہوں جس حال میں رہوں میری کہانی تو ہمیشہ جوان رہے گی۔ تمہارے لئے اور پوری دنیا میں رہنے والے تمہارے دوستوں کے لئے''

نہ جانے اُسکی یہ بات سن کر مجھے کیوں ایسا لگا جیسے سچ مچ مجھے ایک ایسی گرم خبر ملی ہو جسکے تنور پر میں ہمیشہ اپنی روٹیاں سینکتا رہونگا ☆☆

پُلِ صراط

شبستان کے شکم سے ابھی سحر کا جنم نہیں ہوا تھا۔ موذن نے ابھی اذان بھی نہیں دی تھی۔ بند ڈربے میں پڑی مرغیوں نے ابھی اپنے پروں کو پھیلانے کی جسارت بھی نہیں کی تھی کہ باہر خاموش سڑک پر ایک گاڑی لاوڈ سپیکر پر اعلان کرتی ہوئی گذر گئی۔ میں اس اچانک شور سے ہڑبڑا کر جاگ پڑا اور جب تک میں کچھ سمجھ پاتا وہ گاڑی ہمارے محلے کے حدود سے بہت دور نکل چکی تھی اور یوں اُس اعلان کے یہ آخری الفاظ ہی میرے پلے پڑے۔

''سبھوں کو یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ وہ پو پھٹتے ہی نزدیکی پارک میں جمع ہو جائیں''

میں نے بجلی آن کر دی اور بچوں نے اپنے بستر میں کروٹ بدل کر جیسے غیر متوقع روشنی کے خلاف اپنا احتجاج ظاہر کر دیا۔ میری بیوی اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی اور بنا کسی تحقیق و تفتیش کے اپنا فیصلہ صادر کر دیا '' اُٹھ گئے سویرے سویرے سگریٹ پھونکنے کے لئے''

اُسے بات کا بتنگڑ بنانے کی عادت تو تھی ہی لیکن اس وقت مجھے اُس کی بات سے واقعی سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ میں نے سرہانے رکھی سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا اُٹھا کر ایک سگریٹ سلگا ہی لی

''تم نے سنا نہیں باہر کوئی اعلان ہو رہا تھا''

''کیا !'' میری بیوی کو جیسے کسی کٹھمل نے ڈس لیا'' کیا کہہ رہے ہو، کیسا اعلان''

''خدا بہتر جانتا ہے۔ نہ جانے آج پھر کس بات پہ بلاوا آیا ہے'' میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا

''مگر وہ تو کہہ رہے تھے کہ اب کبھی ایسا نہیں ہوگا''

''کون؟ کن کی بات کر رہی ہو؟''

''وہی جو پچھلے دنوں ووٹ مانگنے آئے تھے۔ وہ تو کہتے تھے ہمیں ووٹ دو گے تو تمہیں ایسے بلاوے نہیں آئینگے''

''پاگل ہو تم، ان کا کام تو صرف کہنا ہوتا ہے۔ جہاں تک کرنے کی بات ہے اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی' وہ فیصلہ تو کہیں اور ہوتا ہے''

میری بیوی نے پھر ایک لمبی آہ بھر لی اور نہ جانے خود سے کیا بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور میں کمرے میں گردش کرتے ہوئے دھویں کے مرغولوں کو دیکھتا رہ گیا۔ میرے معصوم بچے خواب خرگوش میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ ناکردہ گناہوں کی سزا پا رہے تھے۔ سگریٹ کا زہریلا دھواں اُنکی نس نس میں سما رہا تھا۔ کھڑکی کے پٹ بھی ایک دوسرے کے ساتھ یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے اُن پر بھی کوئی انجانا خوف طاری ہو چکا ہو۔ وہ ایکدوسرے کو ویسے ہی دلاسہ دے رہے تھے جیسے ہم لوگ اکثر اس بلاوے کے بعد ایک دوسرے کو دلاسہ دیتے رہتے ہیں۔

اعلان نشر کرنے والے لاؤڈ اسپیکر کی آواز اب بھی کہیں دور سے سنائی دے

رہی تھی مگر اعلان کا مفہوم اب بھی شعور کی گذرگاہ سے کافی دور تھا۔

انسان کی فطرت کا یہ رنگ بھی عجیب ہے کہ جو بات اُسکے شعور کے اسکرین پر ایک بار اپنا عکس ثبت کرتی ہے اُسکا ایک ہی اشارہ اُسے سارا مفہوم سمجھا دیتا ہے اسی لئے شاید میں اعلان نہ سننے کے باوجود بھی خود کو آنے والے لمحوں کے لئے تیار کر رہا تھا کیونکہ اس اعلان کا خاکہ برسوں سے میرے ذہن و دل پر ویسے ہی منعکس ہو چکا تھا جیسے دنیا کے نقشے پر برصغیر ہند پاک کے ممالک کا نقشہ اُور اُن کے درمیان نفرتوں اور سرحدوں کی لاتعداد لکیریں جن کے اس پار اور اُس پار نہ جانے کتنے لوگ ایک ''جنت'' کے لئے کٹ رہے ہیں اور اب تو کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ''جنت'' بھی اب گُم ہوگئی ہے اور عنقریب ہی ماہر ارضیات کو ایک اور اہم کام سونپا جا رہا ہے کہ وہ اس گم گشتہ جنت کا سراغ دُنیا کے نقشے پر تلاش کریں۔

میں نہ جانے کس جہاں میں کھو جاتا اگر سگریٹ کی چنگاری میرے بائیں ہاتھ کی درمیانی اُنگلی پر اپنی جلن کا احساس نہ دلا دیتی۔ میں نے سگریٹ کے آخری ایک دو کش لگا کر اُسے ایش ٹرے میں دفن کر دیا۔ سنا ہے زمینی جنت میں اب ہزاروں لوگ بڑی عجلت میں دفن ہو گئے ہیں۔ اب تو ہمارے محلے کے بزرگ بھی یہ صلح مشورہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ قبرستان میں چونکہ میتیں دفنانے کے لئے جگہ نہیں بچی ہے اس لئے محلے کی پارک کو ہی قبرستان بنایا جائے۔ خدا رحم کرے میں تقریباً اُچھل کر بستر سے باہر نکل گیا جیسے میں نے جاگتی آنکھوں سے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔

کچھ دیر کے بعد ہم دونوں میاں بیوی نمکین چائے پی کر اپنی تلخیوں کی کڑواہٹ کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چائے کے سماوار میں اگرچہ ابھی بھی کچھ چائے باقی تھی

لیکن کھڑکیوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی صبح کی روشنی مجھے پارک میں جا کر محلے والوں کے ساتھ شامل ہونے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے فرن پہن کر بیوی کی جانب بے بس نظروں سے دیکھا اور سرد صبح کی ہلکی ہلکی دھند میں کود پڑا۔ میرے ہمسائے بھی ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں سے نکل رہے تھے۔ ہم سبھوں کو معلوم تھا ہمیں کیا کرنا ہے، کس طرح سے خاموشی کے ساتھ اُس پارک میں جمع ہونا ہے۔ جس پارک میں کبھی محلے کی کسی دلہن کا باپ خوبصورت سائیبان لگا کر دولہے کا شاندار استقبال کر کے کشمیری وازوان سے مہمانوں کے منہ کا ذائقہ خوشبودار بنا دیتا تھا۔ اس پارک میں کبھی ہم اپنے بچپن میں کرکٹ کھیلتے ہوئے پٹوڈی، حنیف یا بریڈمین بننے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ اسی پارک میں ہمارے ایک ممبر اسمبلی نے ایک زبردست سیکورٹی کے دوران ایمبسڈر کار کی چھت پر چڑھ کر نہ جانے کون کون سے سہانے سپنے دکھائے تھے۔ آج کل وہ خود سپنوں کی دنیا میں رہتا ہے اور ہم پھر سے اُسی پارک میں جمع ہو رہے ہیں۔ میں اب اُسی پارک کے مین گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے اپنے سکڑے سمٹے ہمسائیوں کو دیکھ رہا تھا جو پارک میں ایک ایک کر کے جمع ہو رہے تھے۔ میں خود بھی سکڑا سہما ایک کونے میں دُبک کے بیٹھ گیا۔ یہ وہی کونہ تھا جہاں ایک زمانے میں ایک ولی خدا کے عرس کے دوران یوپی کے حلوائی اپنا سایٔبان لگا کر لوگوں کو آتش چنار کے رنگ کا حلوہ کھلایا کرتے تھے۔ آج بھی اُس کونے میں ایک سائیبان لگا تھا۔ چاروں طرف سے بند ٹینٹ، نہ جانے اُس ٹینٹ میں کون کون بیٹھا تھا،

کچھ لمحوں کے بعد جب محلے کے سب چھوٹے بڑے مرد جمع ہو گئے تو ہمیں حسب روایت قطاروں میں بیٹھنے کا ''آدیش'' ملا۔ چودہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ بیت

گیا۔ ابھی ہمیں مسجدوں میں صفیں درست کرنے کا سلیقہ نہیں آیا ہے۔ نہ جانے ان حالات میں یہ متعدد صفیں ایک لمحے میں کیونکر اپنے سلیقے کا اظہار کرتی ہیں۔ سبھوں نے مشینی انداز میں اپنی اپنی جیبوں سے اپنا چہرا نکال کر اپنی ہتھیلیوں پر رکھتے ہوئے اپنی ولدیت، سکونت اور پیشے کا گردان کیا۔ کیا معلوم کب کون سا سوال پوچھا جائے۔ ایک گول ربر مہر کے عکس تلے زردی مایل فوٹو لئے ہوئے میرا شناختی کارڈ بھی میرے ہاتھوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا،

''کتنی بار اپنا نام دہرانا پڑے گا، اب تو اپنا نام بھی پرایا لگنے لگا ہے'' میری سوچ میرے اندر مقیّد تھی اور ہم ایک ایک کر کے 'پُل صراط'' پر سے گذرنے لگے۔

سفر طے کرنے کے بعد۔۔۔۔

جب میں اپنے گھر کی دہلیز پر واپس پہونچا تو دروازے کی چوکھٹ پر میری توقع کے خلاف کوئی منتظر نہ تھا۔ میں نے بند دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد اندر سے ایک نحیف ونزار عورت نے میرے لئے دروازہ کھولا۔ کچھ دیر تک میں اُسکے چہرے پر پہچان کے نقوش تلاش کرنے لگا اور جب اُس چہرے نے میری نگاہوں کو اپنی شناخت کا منظر عطا کیا تو میں تقریباً چلا اُٹھا

''تم۔۔ میری بیوی۔۔۔ اتنی بوڑھی۔۔۔؟''

''آو اندر آ جاو۔ برسوں کے بعد لوٹے ہو۔ اندر میرے سوا اب کوئی نہیں رہتا بس ایک ٹوٹا پھوٹا آئینہ ہے، وہی تم کو ساری کہانی سُنا دیگا''

میں گھر کے اندر جانے کی بجائے دروازے کی چوکھٹ پر ہی بے دم ہو کر بیٹھ گیا کیونکہ اب مجھ میں آئینے کے سوالات کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ ☆☆☆

پہلا چہرا

وہ بول رہا تھا اور میں خاموش تھا لیکن میرے اندر جو نامعلوم شخص اُسکی ہر بات کا جواب دینے کے لئے مچل رہا تھا وہ بھی گونگا تھا یا پھر اُسکی زبان کاٹ دی گئی تھی بلکل اُسی طرح جس طرح میری زبان پر تالے لگا دئے گئے تھے۔ میں پچھلے کئی دنوں سے اپنے ہی گھر میں مقید اُس اجنبی کی باتیں سُننے کے لئے مجبور تھا۔ اُسکا ہر حکم ماننے پر مجبور تھا۔ وہ جو چاہتا، کر لیتا تھا۔ میری الماری سے جو سوٹ چاہتا نکال کے پہن لیتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے گھر کے اندر پڑے کیش پر بھی وہ اب ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔ اور اس نوعیت کا ہر ایک کارنامہ انجام دینے کے بعد اُسکے چہرے پر ایک عجیب قسم کی چمک نمودار ہوتی تھی۔ وہ، کوئی عام انسان نہیں تھا بلکہ مجھے تو وہ کوئی بہت بڑا ساحر، جادوگر دکھائی دیتا تھا کیونکہ ہر روز جب وہ میرے منہ پر ایک نیا تالا لگا کر قد آدم آئینے کے سامنے استادہ ہو کر اپنے اصلی چہرے پر ایک اور چہرا لگا کر باہر جانے کے لئے تیار ہوتا تھا تو میرے دل میں ایک ہی خواہش اُبھرتی تھی کہ میں اُس کا اصلی چہرہ دیکھ لوں لیکن میری یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی۔ کھانا کھانے کے دوران وہ بے شک میرے ہاتھ کھول دیتا تھا اور میرے منہ پہ پڑا ہوا ٹیپ اُتار دیتا تھا لیکن تب بھی اُسکی اصلیت کسی نہ کسی نقلی چہرے تلے مخفی رہتی اور میں اُس دل کے نہاں خانوں میں اُبھرنے والی درد بھری چیخ کو

اندر ہی اندر محسوس کر کے رہ جاتا۔ وہ ہر روز ایک نیا چہرہ لگا کر ایک نئی شخصیت کے ساتھ مجھے اپنے ہی گھر میں اپاہج بنا کر کہیں چلا جاتا تھا اور سورج ڈوبنے کے کچھ دیر بعد واپس آجاتا تھا۔

میں پچھلے کئی دنوں سے اُسکے رحم وکرم پر زندہ تھا۔ اگرچہ وہ صبح شام میری ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا لیکن اپنے ہی گھر میں ایک تنہا قیدی کی طرح رہنا میرے لئے کسی سزائے عمر قید سے کم نہ تھا۔ میرا رابطہ باہری دنیا سے مکمل طور کٹ چکا تھا۔ میں ہر روز اُسکے جانے کے بعد اپنے گھر کی کھڑکیوں کے بند شیشوں کے پاس رینگتے ہوئے جا کر چلاّنے کی کوشش کرتا تھا لیکن میری چیخ میرے اندر ہی دب کے رہ جاتی تھی اور میں شدّت کے ساتھ اُس دن کے اپنے فیصلے پر افسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا جس کے طفیل میں نے اپنی ''انٹی لیکچول فطرت'' کے زیر اثر پہلگام کے ایک پہاڑی سرسبز علاقے میں ایک زمین کے ٹکڑے پر ایک چھوٹی سی ہٹ (HUT) تعمیر کر کے بظاہر اپنے تمام شناساؤں سے دور ایک پُرسکون تنہائی کا اہتمام خشک وتر کر دیا تھا۔ اب یہاں دور دور تک کوئی نہ تھا جو میری مدد کو آجاتا۔ اگرچہ کبھی کبھار کوئی چرواہا یا کوئی اکا دکا گوجر یا بکروال مجھے دور اُس پہاڑی پگڈنڈی پر جاتا ہوا دکھائی بھی دیتا تب بھی مجھے اپنی بے بسی اور لاچاری کا احساس خود اپنی زمین میں دفن کر دیتا تھا کیونکہ میں ایک ٹوٹی بانسری کی طرح اپنی فریاد کسی کو سنا بھی نہ سکتا تھا۔

آج وہ شام ڈھلتے ہی لوٹنے کے بعد خلاف توقع مُسکرا رہا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا

''کیوں۔ آج کتنی گالیاں دی میرے نام۔ کتنی بد دعائیں اندر ہی اندر میری

ذات کو دی ہیں۔ اچھا کیا جو بھی کیا۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی وہی کرتا۔ لیکن اب تمہیں خوش ہونا چاہیئے کیونکہ کل سحر ہوتے ہی میں تمہارے اس چھوٹے اور خوبصورت گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خیر آباد کہنے جا رہا ہوں۔"

میں آنکھیں پھاڑے صرف اُسے دیکھتا رہ گیا حالانکہ یہ مژدا جانفزا سننے کے بعد میری آنکھوں سے مسرت کی ایک چمک چھلکنی چاہیئے تھی لیکن نہ جانے کیوں میں ان دو چار دنوں میں ایک پتھر کی مانند تمام احساسات اور جذبات سے بے حس ہو گیا تھا اور شائید یہی وجہ تھی کہ میں سنگدل بھی بن چکا تھا اور سرد مہر بھی۔ حالانکہ میری سنگدلی اور سرد مہری نہ میرا احتجاج بن سکی اور نہ ہی میرا کوئی مداوا کرنے میں کامیاب۔ وہ حسب عادت اپنی باتیں سُنا کر میرے منہ اور میری پیٹھ پیچھے بندھے میرے ہاتھ پیر آزاد کر کے باہر سے لایا ہوا کھانا میرے سامنے رکھ کر میری چوکیداری کرنے لگا لیکن آج میں اسکی توقع کے خلاف اُس سے مخاطب نہ ہوا۔ وہ کچھ لمحوں کے لئے خاموش رہا شائید میرے بولنے کا یا شکریہ کا منتظر تھا لیکن جب میں نے خاموشی سے کھانے کی تھالی کو ایک طرف سرکا کر اپنی خاموشی کا طلسم نہ توڑا تو اُسکے اندر بھرا ہوا سارا زہریلا دھواں جیسے باہر اُبل پڑا۔

"میں تمہیں کل سے آزاد کر رہا ہوں، تمہیں یہ سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ مجھ سے آج کوئی سوال کیوں نہیں پوچھتے۔ پوچھو۔ آج میں تمہارے سارے سوالوں کا جواب دونگا تا کہ تم کسی تجسس کے بغیر اپنی باقیماندہ زندگی گذار سکو"

لیکن میں نے اُس سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ میں نے خاموشی سے اُسی ٹیپ رول کا ایک ٹکڑہ اپنے منہ پر خود ہی چپکا دیا جو وہ ہر روز میرے منہ پر چپکا کر اپنی من مانی کرتا تھا۔ اسکے بعد میں نے اپنے ہاتھ پیر اُسکے قریب کر دیئے تا کہ وہ اپنی مرضی سے مجھے

حسب معمول باندھ کر اپاہج بنا دے۔

وہ غصے سے تلملا اُٹھا اور پھر نہ جانے کیوں اُسنے وہ حرکت کی جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اُسنے بڑی بے دردی کے ساتھ میرے منہ پر چپکے ہوئی ٹیپ کو اُدھیڑ کر پھینک دیا اور بنا میرے ہاتھ پیر باندھے میری نظروں سے اپنے آپ کو بچا کر قد آدم آئینے کے سامنے ایک نیا چہرہ لگانے میں مصروف ہوگیا۔ اب کی بار میری آنکھوں سے درد بھرے آنسوؤں کے ساتھ حیرت بھی ٹپکنے لگی۔ میں نے اُسکی پُشت پر آنکھیں گاڑھ دیں۔ وہ چند لمحوں میں اپنا نیا چہرہ لگا کر جب میری جانب مڑ گیا تو میرے منہ سے ایک دبی دبی سی چیخ نکل گئی۔

میرے سامنے ''میں'' کھڑا تھا۔ ہاں ''میں''۔ بالکل میری صورت۔ اُسنے آج میری صورت کا چہرہ اپنے اجنبی چہرے پر لگا دیا تھا۔ اچانک میری حیرت اُسکی مکروہ ہنسی میں دفن ہوگئی۔

''دیکھا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اب تمہیں میری طاقت، میری ذہانت کا احساس ہو جائے گا۔ میں اب کل کی بجائے ابھی تمہاری اس چار دیواری سے باہر جا رہا ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔ اب میں ''تم'' بن کر وہ کام کرونگا جس سے تمہیں اپنے اس چہرے سے بھی نفرت ہو جائیگی۔ یہی تمہاری آج کی خاموش بغاوت کی سزا ہوگی۔ Good bye''

وہ پلک جھپکتے ہی کمرے سے باہر نکل گیا بلکل اُسی طرح جس طرح وہ پہلے دن آناً فاناً میرے کمرے میں وارد ہوا تھا۔ میں خاموش در و دیوار تکتا رہ گیا اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک ایسے مریض کی طرح اپنے ہاتھ پیر ہلانے لگا جو فالج کے حملے

کے بعد قدرے سنبھلا ہو۔

وہ رات کیسے بیتی، مجھے شائید قیامت صغریٰ کا مفہوم پہلی بار سمجھ میں آیا تھا۔ پو پھٹتے ہی میں اُس قید تنہائی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ہٹ کے خوبصورت لان کو پھلانگتا ہوا جب میں پہاڑی پگڈنڈی پر پہونچا تو چند قدم چلنے کے بعد مجھے میری شکل وصورت کا وہ پراسرار اجنبی ایک دیودار کے سائے تلے خون میں لت پت پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے کچھ حیرت، کچھ خوف کے ملے جلے تاثرات اپنے اندر اُبھرتے ہوئے محسوس کئے اور جب میں نے اُسکے قریب آ کر اُسے چھو کے دیکھا تو اُسکا سرد جسم اپنی آخری کہانی بیان کر رہا تھا، وہ شائید رات کے اندھیرے میں کسی آدم خور درندے کے نو کیلے دانتوں کا شکار ہو چکا تھا، اسکے نرخرے کے دونوں طرف دو سوراخ ایک لہو لہو کہانی رقم کر رہے تھے۔ اُسکے چہرے پر اب بھی میرا ہی چہرا تھا لیکن اب کے اُسکی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کی بجائے کوئی انجانی حسرت عیاں تھی۔

میں نے لرزتے اور کانپتے ہاتھوں سے اُسکے چہرے سے اپنا چہرا کھرُچنے کی کوشش کی۔ آج مجھے اسکا اصلی چہرا دیکھنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن ایک ناقابل بیان مشقت کے بعد جب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تو مجھے اپنی پیٹھ پر کسی آدم خور درندے کے پنجوں اور نوکیلے دانتوں کا احساس ہونے لگا ۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے بوٹی بوٹی نوچ رہا ہو۔ آسمان پر ہزاروں گدھ اور چیلیں منڈلا رہی ہوں۔ اُسکا اصلی چہرہ میرے سامنے بے نقاب تھا۔ لیکن وہ چہرہ میرے لئے اجنبی نہ تھا

وہ۔۔۔۔۔۔اصلیت میں، میں ہی تھا۔ ☆☆

کسوٹی

وہ برش کی ابتدائی حرکات کو اپنے تخیل سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کر رہا تھا کہ اچانک اُسکے بجھتے دل کی ٹمٹماتی لو، پرانے مرض کی ہوا سے کانپنے لگ گئی، اُسکے ہاتھوں سے برش چھوٹ کر گر پڑا، تخیل کے تانے بانے بکھر گئے، وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگا اور فرش پر رکھے ہوئے رنگ بکھر کر سفید کینوا اس کو رنگین کرتے رہے۔۔۔وہ خود تاریکیوں کے گہرے غار میں گرتا چلا گیا اور آخر کار اُس کا تڑپتا، مچلتا وجود بے جان ہو کر ساکت ہو گیا۔

۔۔۔ایک ہفتے بعد ملکی سطح پر منعقد کی گئی مصوری کی نمائیش میں اس کی پینٹنگ کو پہلے انعام کا حقدار قرار دیتے ہوئے جج صاحب نے فرمایا۔

''یہ اُس عظیم فنکار کی وہ آخری پینٹنگ ہے جو اُنہوں نے مرنے سے چند لمحے قبل مکمل کی تھی'' ☆☆

سودا

جب میں اپنے بھائی کے میڈیکل اسٹور پر فرصت کے لمحات گذارنے کے لئے داخل ہوا تو اندر پہنچتے ہی مجھے بڑے بھائی صاحب کا حکم ماننا پڑا۔ وہ کسی کاروباری کام کے سلسلے میں باہر جانے والے تھے اور مجھے کچھ گھنٹوں کے لئے دکان کا کیش کاونٹر سنبھالنا پڑا۔ دکان پر گاہکوں کو مطلوبہ ادویات دینے کے لئے میڈیکل اسٹور پر کئی تجربہ کار ملازم کام کر رہے تھے۔ ان ایک دو گھنٹوں میں ہی مجھے زندگی کے ایک تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ کتنے لوگ درد والم کے ایسے زندانوں میں رہتے ہیں کہ کسی کے پاس درد کا مداوا کرنے کے لئے پوری دوائی خریدنے کے لئے پیسے بھی نہیں ہوتے۔ وہ افسردہ مگر خوبرو نوجوان جب ادویات کی قیمت سننے کے بعد اپنا ڈاکٹری نسخہ واپس لیتے ہوئے بنا دوائی لئے کیش کاونٹر چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کرنے لگا تو میں نے تمام تکلفات بالائے طاق رکھتے ہوئے اُس سے ایک ذاتی سوال پوچھ ہی لیا۔

''کیوں، کیا دوائی خریدنے کے لئے پورے پیسے نہیں ہیں''

''پورے کیا صاحب! میرے پاس تو ایک چوتھائی بھی نہیں'' اُس نوجوان نے

بھی بنا کسی تمہید کے اصلیت بیان کر دی اور میرے اندر کوئی انجانا شخص بے قرار سا ہو اُٹھا۔

''یہ دوائی کس کے لئے ہے''

''وہ۔۔!'' دُور دکان کے ایک کونے میں بینچ پر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے، لاغر شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُسنے میرے دوسرے سوال کا بھی ایک ''واضح'' جواب دے دیا۔ ''وہ میرا باپ ہے صاحب۔ اُسی کے لئے''

''اُو'' میں نے قدرے لمبی سانس کھینچتے ہوئے پھر ایکبار اُن دوائیوں کی جانب نگاہ دوڑائی جو سیلز مین نے کیش کاونٹر پر رکھ دی تھیں اور جن کی قیمت ادا کرنے کی سکت اس نوجوان میں دکھائی نہ دیتی تھی۔ Medical Representative ہونے کے ناطے ادویات کی ایک اچھی خاصی جانکاری مجھے بھی تھی اور میں نے بات پہلی ہی لمحے میں جان لی تھی کہ اس کے باپ کو ''کینسر'' کی بیماری نے آ گھیرا ہے۔

''تم اسے کسی اسپتال میں ایڈمٹ کیوں نہیں کرتے؟''

''ہسپتال سے ہی تو لوٹ کے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے صاف لفظوں میں حقیقت بیان کی ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اب دوا دیتے رہنا۔ باقی اللہ مالک''

"Oh I see" میرے اندر کوئی نازک سی شئے جیسے ٹوٹ کے رہ گئی

''تم ایسا کر لو دوست۔ یہ دوائیاں لے جاو۔ جب پیسے ہوں تب دے جانا'' میں نے اپنے لہجے میں اپنا پن محسوس کیا۔

''لیکن صاحب یہ بارہ سو کی دوائیاں'' وہ حیرت کا بُت بن چکا تھا۔

''کوئی بات نہیں'' میں نے اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کی ''جب پیسے ہاتھ میں

آجائیں تب دے دینا''

''صاحب۔ان ہاتھوں میں پیسوں کو آنا ہوتا تو نہ میری پڑھائی رُک جاتی اور نہ میری ماں۔۔۔'' اسکے آگے شاید اُسکے الفاظ اُسکا ساتھ نہیں دے رہے تھے لیکن اس نے اس آدھے جملے میں اپنی پوری سوانح حیات بیان کردی۔

''اللہ سب ٹھیک کردے گا۔لو۔یہ لے جاو۔میری طرف سے۔ایک دوست کے ناطے'' میں نے ساری دوائیاں ایک لفافے میں پیک کرکے اُسکے ہاتھ میں تھمادیں اور وہ بہتے اشکوں کے ساتھ شکریہ ادا کرکے لاغر باپ کو سہارا دیکر دکان سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے بھی اُس نے دکان کے باہری دروازے پر ایک بار پھر پیچھے مڑ کر میری جانب اُن نظروں سے دیکھا جن میں تشکّر کے موتی زیادہ تھے اور زندگی کی چمک کم۔

اُس رات میں کافی دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ بار بار اُس نوجوان کا افسردہ چہرہ مجھے زندگی کے نشیب وفراز پر سوچنے کی ترغیب دیتا رہا اور میں بار بار اپنے بیڈ روم کی بتی جلاتا اور بجھاتا رہا۔ دوسرے دن میں خود اپنی زندگی کے اُتار چڑھاو میں کھو گیا وہی معمول کا کام۔ ڈاکٹروں کے پاس جاکر اپنی کمپنی کی ادویات کے سمپل (Sample) ٹیبل پر سجا کر Brochure کو ورق ورق اُلٹتے ہوئے دوائیوں کی خصوصیات بیان کرنا اور پھر شہر کے مختلف میڈیکل اسٹورز پر جاکر آرڈر بک کرنا۔ زندگی کی اس تگ ودو میں شاید میں اُس ایک لمحے کو ہمیشہ کے لئے بھول جاتا اگر شہر کے ایک اور میڈیکل اسٹور پر وہ مجھے دوبارہ نظر نہ آتا۔

وہ۔۔۔جس کا نہ مجھے نام معلوم تھا اور نہ ہی پتہ۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کچھ بے چین سا ہونے لگا۔ اُسکی بے قرار آنکھیں بار بار دروازے کی جانب یوں اُٹھنے لگیں جیسے

وہ بھاگ جانے کا رستہ تلاش کرر ہا ہو لیکن اسی دوران اُس میڈیکل اسٹور کے مالک نے اس سے مخاطب ہو کر جیسے اُسکے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں

''تو آپ یہ ساری دوائیاں بیچنا چاہتے ہیں'' میڈیکل سٹور کے مالک نے کاونٹر پہ رکھی جن دوائیوں کی طرف اشارہ کیا وہ ساری کی ساری وہی دوائیاں تھیں جو میں نے ایکدن قبل ازراہ انسانیت اُسے مفت میں عطا کی تھیں۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی آپریشن تھیٹر کے ٹیبل پر لیٹا ہوا ہوں اور کئی نوکیلے، تیز دھار والے اوزار میرے جسم کی چیر پھاڑ کرر ہے ہوں۔ میرے جسم کا سارا خون میری آنکھوں میں چڑھ آیا اور اس سے پہلے کہ میں اپنا کوئی ردعمل ظاہر کرتا وہ نوجوان میری لہو لہوتر آنکھوں کے بلکل قریب آ کر مجھ سے مخاطب ہو چکا تھا۔

''صاحب جی۔ میں جانتا ہوں آپ کیا سوچ رہے ہونگے۔ میرا۔۔۔میرا باپ آج رات کو ہی اللہ کو پیارا ہو گیا صاحب۔ گھر میں اُسکی میت کفن کی منتظر ہے لیکن میرے ہاتھ آج بھی خالی ہیں''

اُس رات میں نے پھر بیڈروم کی بتی بجھا کر اپنے ذہن میں اندھیرا کرنا چاہا لیکن مجھے اُس اندھیرے میں بھی دو آنکھیں نظر آئیں زندگی کی چمک سے عاری

☆☆

تلخیاں

خاور کو اپنی بہن ریشماںؔ کے بارے میں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بچپن سے ہی ایسی کیوں تھی۔ کیا زندگی کے کسی پڑاو پر اُس کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ ہوا تھا کہ وہ ایسی بدمزاج ہوگئی تھی جیسے آگ کا ایک دہکتا شعلہ یا یہ اُس کی فطرت ہی تھی کہ ذرا سا بھی کسی نے ہاتھ آگے بڑھا دیا کہ اُسکی تپش جسم و جان کو بھسم کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی تھی۔ گھر۔ محلّہ یہاں تک کہ اسکے دفتر کے سارے کولیگ بھی اُسکی اس بدمزاجی سے واقف ہو چکے تھے اسی لئے کوئی اُسے منہ لگانے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ حالانکہ پہلی نظر میں وہ ایک قبول صورت، دراز قد اور نہایت ہی سلیقہ مند عورت لگتی تھی لیکن کچھ پل کے اندر تصورات کا یہ محل ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس ہو جاتا تھا جب اُسکی فطرت کا حقیقی رنگ سامنے آکر تمام نسوانی نزاکت اور خوبصورتی کی ضد بن جاتا تھا۔

خاور کو بچپن سے اُسکی بدمزاجی کا شکار ہونا پڑ رہا تھا۔ خاموشی سے زہر کا ایک ایک گھونٹ پینا پڑتا۔ والدین کب کے بچھڑ چکے تھے اور یوں وہ دونوں بھائی بہن اپنے گھر کی چار دیواری میں پروان چڑھتے رہے۔ گھر کی چار دیواری میں اکثر ریشماں کی گرجدار آوازیں گونجتی رہتیں اور خاور اپنے ذہن میں کڑواہٹ کے سانپ کلبلاتے ہوئے محسوس کرتا۔

ریشماں تو پڑھائی کے بعد ایک ایسے چہرے کے ساتھ جینے لگ گئی تھی جو بھیڑ میں بھی اکیلا تھا۔ اس بات کا اُسے خود تو احساس نہیں تھا لیکن اُسکے بڑے بھائی خاور کو اکثر یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اُسکی بدمزاج بہن کی وجہ سے اُسکے اپنے آسمان مستقبل پر خدشات اور اکیلے پن کے کالے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دوستوں کے نیک مشوروں کے باوجود بھی اپنی بہن کے رشتے کی بات کہیں چلانے کی جرأت بھی نہیں کر پاتا تھا۔ اب تو ایک دو برسوں سے محلے کے لوگ بھی کچھ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے تھے۔ کچھ ایک تو یہ کہتے ہوئے بھی سُنے گئے تھے کہ بھائی کو بوڑھی ہوتی ہوئی بہن کا کوئی غم نہیں۔ والدین زندہ ہوتے تو اُنہوں نے لڑکی کے ہاتھ کب کے پیلے کر دئے ہوتے لیکن یہ بھائی ہے کہ جس کو نہ اپنے خاندان کی عزت و ناموس کا غم اور نہ ہی بہن کا گھر بسانے کا ارمان۔

اب بھائی کس کس کو کیا کیا بتاتا کہ اُسے ہر دن، ہر رات یہ احساس سانپ بن کر ڈستا رہتا ہے لیکن ۔۔۔۔ اُسکی بہن کا گھر بسنے کے کچھ دن بعد ہی اُجڑنے کا بھیانک تصور اُسے کئی زہریلے بچھوؤں کا جان لیوا ڈنک برداشت کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ وہ اکثر اپنی بہن کے ساتھ اُسکی تند مزاجی کے بارے میں گھما پھرا کر بات کرنے کی بھی جرأت کرتا تھا لیکن کانٹوں سے مہک آنے کا اسکا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔

جون جولائی کی گرم راتوں نے جنوری فروری کی برفیلی قبا بھی اُوڑھ لی لیکن فطرت اور مزاج کا وہ دائمی عکس ذرا بھر بھی دھندلا نہ پڑا یہاں تک کہ ریشماں کی اُبلتی ہوئی جوانی پر دھیرے دھیرے ایک زوال چھانے لگا۔ اب اُس کے کمرے میں ایک مہنگے خضاب کی بوتل بھی دکھائی دینے لگی لیکن اُسکی زبان نے کچھ اور تلخی بکھیرنی شروع کی

تھی۔ خاور نے جب اس نئے طوفان کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اُسے اپنے دل میں آشنا اور نا آشنا لوگوں کی کڑوی باتوں کی تلخی شدت سے محسوس ہونے لگی اور یوں اُسنے اپنے تمام وسوسوں کو ایک ایسے شخص کے پلے باندھ دیا جو پیشے کے لحاظ سے ایک سیاسی پارٹی کا نامور کارکن تھا۔

شمشاد سے خاور کی ملاقات بھی عجیب ڈھنگ سے ہوئی۔ اُن دنوں الیکشن کا بگل بج چکا تھا اور خاور خود ایک ایسے محکمے میں کام کرتا تھا جس کے ذمے لوگوں کے الیکشن کارڈ بنانے کی ذمہ داری تھی۔ شمشاد اپنی پارٹی کے حامیوں کے کارڈ جلد سے جلد بنوانے کے سلسلے میں اس دفتر کے چکر کاٹنے لگا تھا۔ چند ہی دنوں میں خاور کو شمشاد کے کردار میں ایک ضدی۔ ہٹ دھرم اور رعب دار شخصیت کا احساس ہوا۔ اگرچہ شمشاد زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اُسکی باتوں میں ایک پیشہ وارانہ لہجے کا رنگ بخوبی چھلکتا تھا جس سے اس بات کا اندازہ لگانا قدرے مشکل تھا کہ اُسنے تعلیمی منازل کس حد تک طے کئے ہیں اور جب سے اُسنے سیاست کا پانی پینا شروع کیا تھا اُسکی شہرت کے باغ میں بھی کافی گل بوٹے کھلنے شروع ہو گئے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد خاور اور شمشاد کے درمیان تعلقات کی ایک ایسی ڈور بندھ گئی کہ یہ شناسائی رشتہ داری میں بدل گئی حالانکہ حقیقت میں شناسائی سے رشتہ داری تک شمشاد جیسے شخص کو شیشے میں اُتارنے کے لئے خاور کو بھی کافی سیاسی داؤ پیچ کھیلنے پڑے تھے۔ اُسنے نہ صرف شمشاد کو اپنے گھر بلا کر اپنی بہن سے ملوانے کی کوشش کی تھی بلکہ اُس کے لئے کچھ ایمان داری اور کچھ بے ایمانی والے کاغذی کام بھی کر دئے۔ اسکے علاوہ شمشاد کے کانوں تک یہ بات بھی پہونچانے کی کامیاب کوشش کی کہ ریشماں کو جہیز میں

اپنا پشتنی مکان اور کافی بنک بیلنس ملنے والا ہے اور جب شمشاد کے رشتے کے ایک چاچا نے خاور کے سامنے شمشاد اور ریشماں کی بات کی تو اُسنے ریشماں کے دل میں بھی شمشاد کے تیئں نرم گوشہ محسوس کیا اور یوں اُسے اپنی الگ چھوٹی اور اپنی مرضی کی دنیا بننے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

شمشاد ایک جماعت کا سر گرم سیاسی ورکر ہی نہیں بلکہ حکمرانوں کا چہیتا بھی تھا اور جب وہ اپنی برات لیکر خاور کے گھر کی دہلیز تک آیا تھا تو سیکورٹی کے اچھے خاصے بندوبست کے ساتھ اپنے وی آئی پی براتیوں کے ہمراہ پوری آن بان اور شان کے ساتھ ہی تشریف آور ہوا اور یوں ریشماں شادی کی مناسب عمر کی حدوں کو عبور کرنے کے باوجود ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے گھر کی بہو بن گئی۔ خاور بھی اب اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ اب نہ اُسے اپنوں کے طعنے سننے پڑتے تھے اور نہ ہی غیروں کے نشتر اُسکے دل و دماغ کو چھلنی کر دیتے تھے لیکن وہ اس بات سے بھی غافل نہیں تھا کہ ہر نئی بات نو دنوں تک ہی اپنی تازگی برقرار رکھ پاتی ہے۔ اُسے یقین تھا کہ عنقریب ہی ریشماں کے سسرال سے ایک ایسی خبر آئیگی جو اُسکے گورنمنٹ کوارٹر کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اسکے دل کی چار دیواری کو بھی ہلا کے رکھ دے گی لیکن شمشاد کی سسرال سے ایسی کسی ہوا کا آنا نہ ہوا۔ اور یوں خاور کو ایک اچھے خاصے حصّے اور مکان سے دستبردار ہونے کا دکھ زیادہ دیر تک ستا نہ سکا۔

چند مہینوں کے بعد اُسکی زندگی کا کارواں بھی ایک نئی ڈگر پر آ گیا تھا لیکن اب کی بار شاید اُس کے ذہن میں یہ بات منعکس نہیں تھی کہ نیا ماحول اُسکے لئے بھی اپنے ساتھ نو دن کی ہی تازگی لیکر آیا ہے اور یوں وہ بھی کچھ ہی دنوں کے بعد اپنی زندگی کے اُن

پنہاں گوشوں میں تانک جھانک کرنے لگا جن کی جانب متوجہ ہونے کی اُسے اب تک فرصت نہیں ملی تھی ۔

بظاہر اب تک اُسکی زندگی میں ایسی کوئی لڑکی نہیں آئی تھی جو اُسکے دل کے ساتھ ساتھ اسکے گھر میں بھی گھر کر لیتی۔ اس معاملے میں نہ کوئی سیاست کام آتی ہے اور نہ ہی کوئی مصلحت۔ یہ معاملہ دل کا ہوتا ہے۔ دل کی دنیا میں کبھی کبھی بے اختیاری کے وہ جلوے اظہر من شمس ہوتے ہیں کہ انسان سوچتا رہ جاتا ہے کہ یہ کیونکر ہوا۔ لیکن ابھی خاور کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا ۔

اُسنے کئی بار اپنی شریک حیات کی صورت، سیرت اور فطرت کے بارے میں نگاہ تصور سے سوچ کے آئینے میں کوئی عکس تلاش کرنے کی بھی سعی کی تھی لیکن اُسے ہر بار اپنا آپ غیر مطمئین ہی لگتا تھا۔ اُسے دنیا کی بھیڑ میں کئی چہرے نظر آئے لیکن یا کسی کی صورت اچھی نہیں تھی یا پھر کسی کی حثیت اُسے متاثر نہ کر سکی۔ کسی میں اُسے اپنی بہن کی تلخی نظر آتی تو کسی میں انتہائی سادگی۔ اسے پہلی بار یہ احساس ہونے لگا کہ اپنی زندگی کا ہم سفر چننا کتنا کارے دار دوالا معاملہ ہے۔ اُسنے کئی بار اپنی سوچ کے آئینے توڑنے کا بھی جتن کیا۔ لیکن ہر بار آئینے کی کرچیں دور دور تک بکھر تو جاتی تھیں لیکن پھر بے اختیار انہیں کرچوں میں اُسے نت نئے عکس نظر آنے لگتے۔

اُس شام بھی جب وہ اپنے دفتر سے اپنے گورنمنٹ کوارٹر کی طرف لوٹ رہا تھا تو ایک نیا عکس اسکی سوچ کے آئینے میں رقص کرنے لگا تھا۔ وہ خوبصورت لڑکی سائیمہ جو اُسکے آفس میں نئی نئی appoint ہو کر آئی تھی۔ ہر معاملے میں ایک حسن کی مورت تھی۔ اُس رات اُسے ایسا لگا جیسے یہ عکس ایک دائیمی رنگ لئے اُسکے نہاں خانہ دل میں اپنی تمام

تر رنگینیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو چکا ہو۔

سائیمہ ایک ایسی لڑکی تھی جو بہت کم بولتی تھی اس لئے خاور کو اُسے اپنی میز پر Unneccessary روکنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہر دن ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ سائیمہ کو اپنے چیمبر میں بلاتا لیکن پھر دل کی بات کہنے کے بجائے کچھ ضروری اور غیر ضروری فائیلوں کا ذکر کر کے خود اپنے ہتھیار اپنے ہی سامنے سرنڈر کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

یہی تو انسان کی فطرت ہے۔ دوسروں سے ہارنے کے باوجود بھی وہ شکست تسلیم کرنے کی جرأت نہیں کر پاتا ہے لیکن اپنے ہاتھوں کھائی ہوئی ہزیمت کا احساس اسکی نس نس میں لہو بن کے دوڑتا ہے۔

سائیمہ کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے کے بعد خاور کو اس بات کا پتہ چل چکا تھا کہ سائیمہ ایک یتیم لڑکی ہے جو اپنی نوکری سے اپنی اور اپنی بوڑھی بیمار ماں کی پرورش کیا کرتی تھی۔ کوئی ایسی رکاوٹ نہ تھی جو خاور کے سپنوں کو چور چور کر دیتی۔ بس ضرورت تھی تو ایک اظہار کی۔ اور یہی اظہار خاور کو بہت بھاری لگنے لگا تھا۔ اس طرح جب خاور کا خواب اُسکی بے سکون نیند کی آغوش تک ہی محدود رہا تو اُسنے اپنے اندر چھپے اُسی خاور کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی جس نے اُسے اپنی بد مزاج بہن سے چھٹکارا پانے کی سیاست سمجھائی تھی۔

اُس رات وہ دیر تک سیاسی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی محبت کی منزل کو جیتنے کے منصوبے بناتا رہا۔ اور دوسرے ہی دن اُس نے اُنہیں عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی۔ حسب معمول سائیمہ اُسکے بلاوے پر اُسکے آفس چیمبر میں ایک فائیل لیکر حاضر

ہوگئی۔ کچھ لمحوں کے بعد منصوبے کے تحت چپراسی میز پر سپیشل چائے رکھ کر کمرے سے باہر بھی جاچکا تھا ۔اب اُس سیاست کی باری تھی جس کے تحت اُسنے اپنے بہنوی شمشاد کو بھی شیشے میں اُتارا تھا ۔تمام ہمت جمع کرنے کے بعد سیاست سے لبریز وہ مختصر جملہ خاور کی زبان سے ادا ہو ہی گیا۔

''سائیمہ ۔کیا میں تمہاری ماں سے مل کر تمہارے شاندار مستقبل کی بات کرسکتا ہوں؟''

متوقع طور سائیمہ نظریں جھکا کر نہایت ہی حلیمی کے ساتھ خاور سے مخاطب تو ہوئی لیکن پہلی بار خاور کو اُس کے حلیم لہجے میں اُس کی بدمزاج بہن کے تلخ لہجے سے بھی زیادہ جان لیوا کاٹ محسوس ہوئی ۔

''آپ تو ہمارے سرپرست ہیں سر۔ آپ جو چاہیں کریں سر۔ کیونکہ ایک سرپرست کے ہاتھوں ہی بیٹی کا مستقبل شاندار بنتا ہے۔۔''

خاور کی نگاہیں نہ جانے کیوں ہلکے سے جھک گئیں اور آج پہلی بار اُسے میز پر رکھے شیشے میں اپنے سر کے سفید بال نظر آئے جن پر وہ اپنی کسی سیاست کا خضاب نہیں لگا سکتا تھا۔ ☆☆

فرار

میں جب اُسکے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے قلم سے کچھ لکھ رہا تھا اور جب میں اُس کے سامنے قدرے بے تکلفی سے بیٹھ گیا تب بھی اُس کا قلم سفید کورے کاغذ پر نشتر زنی کر رہا تھا۔ باتوں باتوں میں جب میری نگاہیں اُس کاغذ پر مرکوز ہو گئیں تو میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اُسنے کاغذ پر چند بے ربط الفاظ تحریر کئے تھے۔

''چیختی انگلیاں۔۔۔۔مچلتے آنسو۔۔۔۔برستے پتھر۔۔۔۔قید''

اور صفحے کے آخری کونے سے ذرا اُوپر وہ نمایاں لفظ ''سوچ'' یقیناً ذہن کو دعوتِ فکر دے رہا تھا۔

میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیکر اُسے کریدنے کی کوشش کی لیکن پہاڑ اپنی جگہ اٹل تھا اور ندی پتھروں سے سر ٹکرا کے رہ گئی۔ وقت کے دھارے میں موضوع کی دھجیاں بہہ گئیں اور تجسس کے دبیز اندھیرے لئے رات نے میری آنکھوں کے دروازے پر دستک دی۔

حالات نے کب کروٹ لی کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکا لیکن جب بدلتی رنگت لئے کچھ عکس اُبھرنے لگے تو میں پھر اُسکے تنہا تنہا سے حجرے میں جا پہنچا۔

آج بھی وہ سفید کورے کاغذ پر کچھ نقوش اُبھار رہا تھا۔ آج بھی میں تجسّس کے دائیرے میں مقید سگریٹ کے بے ربط مرغولے تخلیق کر رہا تھا۔ اُس کی زبان اب بھی سر بمہر تھی اور میرا اشتیاق آج بھی بیکراں۔

''خوف۔۔۔ترغیب۔۔۔۔تیز ہوا۔۔۔۔سنگین مایوسی۔۔۔۔''

بے ربط لفظوں کا کارواں عقل کی شاہراہ پہ دھول اُڑاتا جا رہا تھا اور میں اشتیاق کے جھمیلوں میں کسی حسین تصور کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔

مدت کا لفظ کب تولد ہوا۔ یہ نہ اُسے خبر تھی اور نہ مجھے۔ میں تو ثانیوں کا شکار رہا اور جب گذرے لمحوں کی بند کتاب کے اوراق گرم ہواؤں نے اُلٹ کر راکھ کر دیئے تب اشتیاق نے اُس راکھ سے زمین کے ماتھے پر یہ عبارت رقم کی۔

''اُس کی جانب انگلیاں اُٹھی تھیں۔ وہ اُنگلیاں جو چیخ رہی تھیں۔ وہ خاموش تھا۔ آنسو اُسکی پلکوں پر مچل رہے تھے۔ اُنگلیوں نے ہاتھوں کی مدد لی اور اُس پر پتھر برسنے لگے۔ وہ پتھروں کے حصّار میں قید ہو کے رہ گیا۔ لہولہان جسم کا درد سہتے سہتے، لیکن اُسے کوئی خوف نہ تھا۔ اُس کا حوصلہ اُسے ترغیب دے رہا تھا کہ اُن تیز ہواؤں کو بھی سنگین مایوسی کا شکار ہونا پڑا جو اُسے مٹانے کے لئے نہ جانے سمندر پار کس دیس سے آئی تھیں''

آج وہ اس دنیا میں نہیں تھا

لیکن وہ ایک کہانی کا عنوان بن کر ایک کتاب کا ورق بن چکا تھا۔☆☆

فرق

عمر بھر وہ لوگوں کی نفرت کا نشانہ بنتا رہا۔ ہر ایک کی نفرت بھری نگاہیں اُس کے جسم کو چھلنی کرتی رہیں۔ اس کا اپنا آئینہ بھی اُسے چڑاتا رہتا تھا۔ ہر بار وہی چہرے کے بھدے نشان، پتلی اور دھنسی ہوئی آنکھیں، بے ڈھول موٹی سی ناک اور بے ترتیب لمبے پریشان بال۔ اُسنے آئینہ دیکھنا ہی چھوڑ دیا ۔۔ لیکن ۔۔۔۔۔۔

آج ۔۔۔ وہ اُس معصوم بچی کی خوبصورت پیاری پیاری آنکھوں میں اپنے لئے ایک اپنا پن، ایک محبت کا معصوم سا عکس دیکھ کر حیرت کا بت بن کے رہ گیا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر شک سا ہونے لگا۔ کہیں میری جگہ کوئی اور تو کھڑا نہیں ہے ۔۔۔ وہ خود سے ہی مخاطب ہونے لگا تھا لیکن جب وہ قدرے جھجکتے ہوئے اُس معصوم بچی کے قریب پہنچا تو وہ ایک مقدس مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی اُسکا استقبال کرنے لگی۔ کیا یہ ایک خواب ہے ۔۔ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ اچانک ۔۔۔

بچی نے اُس کے چہرے پر اُگی ہوئی خوبصورت داڑھی پر ہاتھ پھیر دیا اور وہ اپنے وجود کا فرق محسوس کر کے بچی کو بے اختیار چومنے لگا۔ ☆☆

بند دروازہ

بہت دیر تک دروازے کے سامنے کھڑا رہنے کے بعد آخر کار وہ دستک دے ہی بیٹھا۔ دستک کی آواز تنگ گلی کے در و دیواروں سے ٹکرا کر بکھر گئی۔ اسکی نگاہیں دروازے کے پٹ ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے دیکھنے کی خواہاں تھیں لیکن بند دروازہ وا نہ ہوا۔ اُس کے ہاتھوں نے پھر دروازے کے احساس کو جگانا چاہا لیکن بند دروازے کے حس جیسے بے کار ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ حیرانگی اور مایوسی کے بوجھ تلے دبنے لگا۔

کیا۔ یہ وہ گھر نہیں۔ یہ وہ گلی نہیں؟ اور کیا۔۔ کیا وہ یہاں نہیں رہ۔۔۔؟ چند سوالات اُس کے ذہن پر ہتھوڑے مارنے لگے اور وہ بند دروازے کی اوُر اُمید و بیم کی جلتی شمعوں سے تکنے لگا۔ چند بھولی بسری یادیں دروازے پر رقصاں ہو گئیں۔ اور۔۔۔۔

تب دروازہ تھوڑا سا کھل گیا تھا۔ سہمی سہمی سی دو آنکھیں باہر جھانکنے لگیں تھیں

دروازہ کھٹکھٹانے والے کی صورت دیکھ کر سہمی نگاہوں میں ایک انجانی چمک نے ڈیرہ ڈال دیا تھا اور پھر دروازہ اُسکی راہ سے ہٹ گیا تھا اور پھر وہ گہری نگاہوں کے راستے مکان میں داخل ہو گیا تھا۔ دروازے کے پٹ بند ہو گئے تھے جیسے اُن دونوں کو دروازے نے اپنے اندر جذب کر دیا ہو۔

چند لمحوں کے بعد کچھ سرگوشیاں اُبھریں تھیں۔

''نہیں۔نہیں۔۔۔جذبات کی آندھی سے یہ شمع نہ بجھا دو۔ میں محبت کے دامن پر یہ داغ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں جا رہا ہوں۔۔تم پھر سوچ لینا۔ اس جذبے کو دائیمی روپ دینے کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں پھر آؤنگا، ۔۔اور وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا۔

آج۔۔۔۔۔وہ پھر آیا تھا لیکن آج دروازہ بند تھا۔

اُسے ''فیصلے'' کا انتظار تھا لیکن اُسے کیا معلوم کہ مکان کی سب سے اوپر والی منزل کے ایک کمرے میں ایک نوجوان کو اُسنے اپنے فیصلے کے آئینے میں اُتار دیا تھا

کمرے میں جلتی ہوئی واحد شمع پگھل رہی تھی اور

دستک کی آواز دھیرے دھیرے ہوا میں جذب ہو رہی تھی

☆☆

ایک ادھوری کہانی

پاکیزگی کا معطر لمحہ جن دنوں اپنی خوشبو بکھیرا کرتا تھا اُن دنوں ہم اپنی ماں کی گود میں یا تو پریوں کے ساتھ کوئی حسین خواب دیکھ رہے تھے یا پھر ہمارے رونے کو بھوک کا اشارہ سمجھ کر ماں ہمیں بڑی شفقت سے اپنی چھاتی کے ساتھ لگایا کرتی تھی۔ تب شاید ہماری سوچ میں سوچنے کا کوئی انجان سا مادہ سرائیت نہیں کر چکا تھا لیکن اب جبکہ ہمیں ہر لمحے اپنے شعور کے ریگستان میں فکر کے آتش فشان کا لاوا اُبلتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو سوچ کے بادل بھی آس پاس منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تب اُن لمحات میں، ہمارا باپ ہمیں اُس موٹی کتاب کے چند اوراق پڑھنے کے بعد اپنے قریب بلا کر ایک دلچسپ کہانی سنایا کرتا۔۔۔ایک خوبصورت لڑکی کی کہانی، جسکے بال سنہری تھے، سونے جیسے چمکتے ہوئے، جسکی پائل جب چھن چھن کر بجتی تو زمین پر جیسے موتی بکھرتے تھے۔۔ ہمارا باپ اکثر اُس کہانی کے دوراں یہ کہنا نہیں بھولتا تھا کہ وہ خوبصورت لڑکی ایک کمہار کی بیٹی تھی، کمہار جو بڑے ہی خوبصورت مٹی کے برتن بنایا کرتا تھا۔۔ وہ لڑکی جسکا نام ''فردوس'' تھا، مجھے وہ نام اب بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔

بہر حال فردوس اکثر اپنے کمہار باپ کا ہاتھ بٹانے کی خواہش کا اظہار کرتی تھی لیکن کمہار باپ اُسے مٹی کے اُس بڑے ڈھیر سے دور لے جا کر کچے مکان کی دہلیز پر بٹھا

کر اُسکے ہاتھ میں اردو کا کوئی قاعدہ تھما دیتا۔ بوڑھے کی ایک ہی خواہش تھی کہ اُسکی بیٹی بھی ایک عالیشان محل کی زینت بنے۔۔لیکن اُسکی بیٹی کے مقدر میں پڑھ لکھ کر بھی کوئی محل نہ لکھا گیا۔ایک دن ایک باتونی شخص کمہار کے پاس آیا۔اُسے کئی خوبصورت خواب دے کر کسی عام سے گھر کے لئے اُسکی بیٹی کا ہاتھ مانگ کے لے گیا اور چند ہی دنوں میں وہ خوبصورت ہاتھ حنا کے رنگ میں رنگ گئے۔

اُسدن بوڑھا کمہار جب اپنی ''فردوس'' کو ڈولی میں رخصت کر کے واپس گھر کے مایوس آنگن کی جانب بوجھل قدموں سے لوٹ کے آیا تو دیکھنے والوں نے آخری بار اُسے اپنی ٹانگوں پر چلتے ہوئے دیکھا۔اُسکے ٹھیک دس دن بعد وہ چار کاندھوں کے سہارے قبرستان کے وسیع وعریض عالم میں گم ہو گیا۔۔۔۔

اسکے بعد ہمارا باپ خاموش ہو گیا تھا۔حقے کی ایک چلم بھر کر دھویں کے کالے ہلکے نیلے رنگوں کے مرغولے بنا کر وہ ہمارے تجسُس کو شائید بھڑکانے کی سعی کرتا تھا اور ایک شام جب ہم۔۔میں اور میرا بڑا بھائی اُسکی منت ساجت کرنے لگ گئے تو اُس نے ہمارے سراپا کا جائیزہ لیکر کچھ کہنا چاہا کہ اچانک دوسرے کمرے سے ہماری ماں کے چلاّنے کی آواز آئی تھی۔ماں کو ایک پرانی بیماری نے پھر آگھیرا تھا۔ہمارا باپ پرانے نسخے کو الماری سے نکال کر گلی کے نکڑ پر واقع دوائی بیچنے والے کے گھر کی طرف روانہ ہوا لیکن نہ وہ واپس لوٹ کے آیا اور نہ ہی ہمارے گھر میں پھر کبھی ماں کی آواز ہی سنائی دی۔

کہانیوں کی کتاب دیمک کی نذر ہوگئی اور گھر کی دیواروں پر یاسیت کے اندھیروں نے بے بسی کے وہ نقوش ثبت کرنے شروع کئے کہ سارا بچپن اُنہی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔

آج میں پچیس سال کا جوان ہوں۔ آج میرے سامنے کاغذ کا ایک پرچہ ہے۔۔ وہی پرچہ جو مجھے اپنے شہر کے ایک بڑے میدان میں ہزاروں لوگوں کے سامنے حکومت کے ایک سربراہ نے دیا ہے۔ باپ کی جگہ نوکری کا پروانہ۔۔ جسے دیکھنے کے لئے اب میرا بڑا بھائی بھی موجود نہ تھا۔۔ وہ بھی تو فردوس کی طرح نہ جانے کس دیس چلا گیا تھا۔ میں وہ لمحہ بھی کسی کے ساتھ بانٹ نہ سکا۔

اُس رات نہ جانے کیوں مجھے باپ کی سنائی وہ کمہار کی بیٹی کی کہانی یاد آنے لگی۔ لیکن۔۔۔ کہانی کا انجام کیا تھا۔۔

زندگی جب کسی نکتے پہ آ کے رُک جاتی ہے تو اُسے کاغذ کی کشتی پہ سوار کر کے کنارے تک پہنچایا نہیں جاسکتا۔ فردوس کی کہانی کا انجام میرے باپ کو معلوم تھا۔۔ مجھے باپ کی زندگی کا انجام، ماں کی تڑپتی زندگی ،نوکری کا ایک پرچہ ،سب کی کہانی نظروں کے سامنے تھی لیکن کمہار کی بیٹی کا انجام۔۔ وہ سب کچھ مجھے باپ کی کتابوں میں بھی نظر نہ آیا۔۔ کیا ہمارا باپ ہمیں ایک سنی سنائی کہانی سنایا کرتا تھا لیکن سنی سنائی کہانیوں کا بھی ایک انجام ہوتا ہے۔۔ آخر فردوس کی کہانی کا بھی کوئی انجام رہا ہوگا۔۔ اور پھر وہ کہانی سنی سنائی ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ ہمارا باپ اکثر ہمیں اُس کمہار کی اجڑی قبر دکھا کر یہ کہا کرتا تھا "یہ ہے اُس بیچارے کمہار کی بے بسی کا مزار جو زندگی بھر بڑے خوبصورت مٹی کے برتن بنایا کرتا تھا لیکن جسکی بیٹی۔۔۔۔"

میں آج بھی سوچ رہا ہوں کہ آخر کمہار کی بیٹی کی ڈولی جب کمہار کے گھر سے نکلی تھی اُسکے بعد ایسا کیا ہوا تھا جو ایک جہاں دیدہ باپ اپنے معصوم بچے کو بتا نہ سکا۔؟ ☆☆☆

خلیج

ایک دھماکہ ہوا اور۔۔۔

وہ چونک پڑی

ماضی اُسکے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تھا۔

تب۔۔اُس نے ماں کے منہ پر رس بھرے چاولوں سے بھری تھالی دے ماری تھی اور ماں نے بنا کسی غصے کا اظہار کیئے چاول پونچھنے کے لئے اپنے منہ پر ہاتھ پھیر دیا تھا۔

اب۔۔حال، اُسکے حال پر ہنسی اڑا رہا تھا

آج اُس نے بھی چاول پونچھنے کے لئے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرنے کی سعی کی تھی لیکن۔۔۔

اُسکے سامنے غصے سے بپھرتی ہوئی بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس اُس کی دبلی پتلی بیٹی نے جو برتن اُسکے منہ پر دے مارا تھا وہ۔۔۔

بلکل خالی تھا ☆☆

سحر ہونے تک

سنسناتی ہوئی کوئی چیز اُسکے کانوں کے قریب سے ہوتی ہوئی گذر گئی اور وہ چونک پڑا۔ وہ کچھ لمحے قبل شنکر آچاریہ کی پہاڑی پہ کھڑا دور ڈل کی لامحدود وسعتوں کے اس پار اُن یادوں میں کھویا تھا جب وہ اپنی حسین بیوی عندلیب کے ساتھ ان ہی وادیوں میں پہلی بار آیا تھا۔ پہلی بار۔۔ اسکے بعد ہی تو اُسکی دنیا بدل گئی تھی۔۔ وہ ایک ہی جست میں آسمان پر پہنچ چکا تھا لیکن۔۔۔ یہ سنسناتی ہوئی چیز۔۔۔ وہ چونک کر جب گرد و پیش کا جائیزہ لینے لگا تو اُسے پہاڑی کی سیڑھیوں پر اُترتے چڑھتے سیاحوں، اور مندر میں حاضری دینے اور ماتھا ٹیک کر واپس لوٹنے والے لوگوں کے چہروں پر بھی کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آئی جو کسی ان ہونی یا کسی حادثے کی خبر دیتی۔۔ پھر یہ سنسناتی ہوئی چیز کیا تھی جو ایک مدھم سی آواز ''شی'' کے ساتھ اُسکے کانوں کے قریب سے ہو کر گذر گئی۔۔ کیا یہ سب اُسکا ایک وہم تھا۔ یا پھر۔۔۔

کچھ لمحے اپنے گرد و پیش کا جائیزہ لینے کے بعد، دور ڈل کی پھیلی ہوئی خوبصورت اور نرالی دنیا پر ایک الوداعی نگاہ ڈالنے کے بعد وہ شنکر آچاریہ کی پہاڑی پر بنی خوبصورت سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ اُسکے عقب میں شنکر آچاریہ کے مندر کا گھڑیال

بھی بج رہا تھا لیکن اُسکے کانوں میں سائیں سائیں کرتی ہوئی اُس سنسناتی چیز کی آوازیں ہی گونج رہی تھیں۔

اُس رات ''نیو تاج ہاوس بوٹ'' میں دیر رات گئے تک وہ ایک انگریزی روزنامے کی ورق گردانی کرنے کے ساتھ ساتھ اُس چیز کی اصلیت کے ہر پہلوؤں پر بھی غور کر رہا تھا جو ایک انجانی غیر محسوس شے کی طرح جیسے اس وقت بھی ہاوس بوٹ کے اُس نیم گرم کمرے میں اُسکے قریب موجود تھی۔ لیکن وہ کچھ اخذ نہیں کر پار ہا تھا۔ یا تو اُسکا ذہن ڈل کی خاموش رات کی طرح سو چکا تھا یا پھر وہ شے اُسکے تصور کی حدوں سے پرے تھی۔۔ آخر وہ کیا شے تھی جو سنسناتی ہوئی گذر گئی اور اُسکے بغیر کسی اور نے اُسے نوٹ ہی نہیں کیا۔ دھیرے دھیرے اُسے ایسا لگا جیسے وہ ایک انجانے خوف نما تجسُس کا اسیر ہونے لگا ہے۔ اُس کا ذہن و دل ارتعاش کا شکار ہونے لگا۔۔۔

کہیں کسی نے۔۔؟

نہیں۔۔'' وہ خود ہی خود سے سوال بھی کرتا رہا اور خود ہی خود کو جواب بھی دیتا رہا۔

''ہنہ۔۔۔ وہ ایک معصوم پرندہ رہا ہوگا جو اُڑتا ہوا اُسکے قریب سے نکل گیا'' وہ اپنے آپ کو دلاسہ دینے لگا۔۔۔ اُسنے ذہن کو دوسری جانب متوجہ کرنے کے لئے اخبار نیچے رکھ کر سگریٹ سلگا کر اپنے من کو پُر سکون بناتے ہوئے سوچ کے تمام در و بام بند کرنے کی سعی کی لیکن صرف انسان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ انسان کے ذہنی حجرے میں کسی نہ کسی شگاف سے کوئی نہ کوئی خیال اپنے تمام تر وجود کے ساتھ داخل ہو ہی جاتا تھا چاہے انسان لاکھ اُسے جھٹکنا چاہے اور اُسکے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

تیراں سال بعد وہ کشمیر میں آیا تھا۔ ان برسوں میں اُسنے بار ہا کشمیر آنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن پروگرام بنتے بنتے رہ جاتا۔ کبھی ایک انجانا سا خوف اُسکے رگ و پے میں سرائیت کر کے اُسے کشمیر جانے سے روکتا اور کبھی وہ اپنے ذہن میں اُبھرے خیال میں کئی کئی دن، ہفتے یا سال بھر یوں مقید رہتا کہ سیاحت کا سیزن آ کر گذر بھی جاتا اور اُسے خبر بھی نہ ہوتی۔

وہ تھا تو کشمیر کا ہی ایک باشندہ لیکن بہت پہلے اُس نے کلکتہ میں ایک بنگالی خوبصورت اور مالدار لڑکی عندلیبؔ سے شادی کر کے اپنا گھر بسانے کا ایک خوبصورت خواب تعبیر سے ہمکنار کر دیا تھا۔ عندلیبؔ۔ ایک حسین پیکر۔ ایک مسحور کن خیال۔

وہ خیال ایک مجسم پیکر بن کر آج نہ صرف ہاوس بوٹ کے اُس خوبصورت کمرے میں داخل ہوا بلکہ اُسکے قریب بیڈ کے ایک کنارے پر بیٹھ کر اُسکی جانب مسکرا کر اُسے ایک ٹک دیکھنے بھی لگا۔

''عندلیب۔۔۔۔تم۔۔۔۔'' وہ اُس پیکر کو دیکھ کر چونک پڑا

''ہاں۔۔ میں۔۔ کیوں۔۔ تمہارا کیا خیال تھا کہ مجھ سے دور بھاگ کر۔۔ تم مجھ سے پیچھا چھڑا لوگے''

''مجھے تم سے کوئی بحث نہیں کرنی ہے۔۔ کوئی بات نہیں کرنی ہے''

''کوئی ضرورت نہیں۔۔ میں یہاں صرف تمہاری تڑپ دیکھنے آئی ہوں۔۔ مجھے بھی تمہارے ساتھ نہ ہی کوئی بات کرنی ہے اور نہ ہی کوئی بحث''

'لیکن تم اور یہاں؟''

اس سوال کا جواب دونگی تو بحث کا یا باتوں کا ایک سلسلہ خود بخود شروع ہو

جائیگا۔۔کہوتو جواب دوں۔۔۔پھر کوئی سوال نہیں پوچھنا''

''بھاڑ میں جائیں سارے سوال اور سارے جواب۔۔تم یہاں میری تڑپ دیکھنے آئی ہونا لیکن تمہیں یہاں مایوسی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا۔ دیکھو میں کتنا پُرسکون ہوں تمہارے بغیر''

عندلیبؔ کا پیکر صرف مسکراتا رہ گیا۔ مسکراہٹ جس میں مٹھاس سے زیادہ کڑواہٹ تھی'' کسے فریب دے رہے ہو، مجھے یا خود کو۔ میں تمہاری نس نس سے واقف ہوں''''عندلیب نے جیسے اُسکی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا'' میں جانتی ہوں کہ تمہیں میرے چہرے، میری باتوں اور میری موجودگی سے نفرت ہے لیکن کیا تم اُس سنسناتی ہوئی شئے کی حقیقت جاننے کے لئے بھی مجھ سے بات نہیں کروگے''

''کیا۔۔! ''اُسکی سانسیں جیسے رُکنے لگیں۔۔۔وہ۔۔وہ اُس سنسناتی ہوئی چیز کے بارے میں کیسے جانتی ہے'' اُسنے خود سے ہی ایک سوال کیا لیکن سوال اُسکے ذہن سے ٹکرا کر جواب کی بازگشت نہ سنا سکا۔

''میں جانتی ہوں کہ وہ شئے کیا تھی'' عندلیب بیڈ کے کنارے سے اُٹھ کر اُسکے قریب آتی ہوئی بولی ''آو۔۔۔میں تمہیں بتاتی ہوں۔۔وہ کیا شئے ہے''

بولو۔۔۔۔''وہ سارے ہتھیار ایک طرف رکھ کر خود سپردگی کی حد تک ایزی چیر پر نیم دراز ہو گیا۔

''وہ۔۔۔نہ گولی کی آواز تھی اور نہ کسی پرندے کی'' وہ دوبارہ بیڈ کے اُس کنارے پر آکر بیٹھ گئی۔

''پھر۔۔۔پھر کیا تھا وہ۔۔۔''

خود غرض ۔۔۔ابھی تو مجھ سے بات کرنے کی بھی چاہت نہ تھی ۔۔اب اپنی غرض ہے تو سوال پہ سوال پوچھے جا رہا ہے'' وہ اندر ہی اندر بڑبڑاتی رہی لیکن اُسنے زبان سے یہ جملہ ادا کیا ۔ ''تم میری بات کا یقین کرو گے ۔۔۔ جو میں کہوں''

''ہاں''

''کیوں''

''کیونکہ میرے بغیر اُس شئے کے بارے میں صرف تم جانتی ہو۔ ہوسکتا ہے تمہاری معلومات مجھ سے بہتر ہوں''

''تمہاری معلومات اُس شئے کے بارے میں نفی کے برابر ہیں ۔۔ کیوں؟''

''بحث نہیں ۔۔ صرف ایک سوال کا ایک جواب ۔۔ وہ شئے کیا چیز تھی؟'' اُسنے اپنی انا کا بھرم رکھنے کی کوشش کی

''Dictation نہیں ۔۔ سوال کا جواب چاہئے تو سوالی بن کر رہو'' ہے ۔۔ عندلیبؔ نے بھی جوابی حملہ بول دیا

''ٹھیک ہے، بولو، کیا شئے تھی وہ؟'' اُسکا سمجھوتہ یا پھر surrender

''وہ تمہاری روح تھی، جو سنسناتی ہوئی تمہارے جسم سے خارج ہوگئی''

عندلیبؔ کا یہ جملہ گولی کی طرح اُسکے جگر کے آر پار ہوگیا لیکن وہ اپنی حیرت کو چھپا کر اپنی تند مزاجی کو ہی سامنے لے آیا ''کیا بکتی ہو تم''

''یقین نہ آئے تو سویرے خود ہی دیکھ لینا۔ اس ہاوس بوٹ سے اُس علاقے کے پولیس اسٹیشن تک تمہاری موت کا ہی ذکر ہوگا''

''Nonsence ۔۔۔ میں ۔۔ میں زندہ ہوں'' اپنے تمام تر ہوش و حواس کے

ساتھ''

''یہ خیالی پیکر ہے میری طرح۔۔جس طرح میں حقیقت میں تمہارے سامنے نہیں ہوں اُسی طرح تم بھی حقیقت میں اس وقت زندہ نہیں ہو۔۔میرا جسم اس وقت بھی کہیں اور ہے''

''او۔۔میں'' وہ خود سے ہی خوفزدہ سا ہونے لگا لیکن پھر سنبھل گیا ''نہیں۔۔تم جھوٹ بول رہی ہو۔۔ایسی کہانیاں تو صرف فلموں میں ہوتی ہیں۔۔میں مرا نہیں ہوں۔۔ یہ تمہارا کوئی فریب ہے۔۔آخر میری موت کا کوئی سبب، کوئی مقام، کوئی وقت۔۔۔؟''

''سب گذر چکا ہے'' عندلیب نے اُس کی بات کاٹ دی ''سبب۔۔ہارٹ اٹیک۔۔مقام۔۔اُس پہاڑی کا دامن۔۔وقت۔۔تم اچھی طرح جانتے ہو۔اُس وقت دن کا سورج اُس ڈل کی بانہوں میں سونے لگا تھا''

''وہم ہے تمہارا۔۔میں زندہ ہوں۔۔کہو تو ابھی بل بجا کر اس ہاوس بوٹ کے ویٹر کو بُلا سکتا ہوں''

''اگر اسی سے تمہاری تسلی ہو سکتی ہے تو بلاو، بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے'' عندلیب کے لہجے میں اب بھی وہی اعتماد تھا اور عندلیب کے اسی اعتماد نے مرد کو ایکبار پھر اپنے ہی آپ سے خوفزدہ کر دیا۔

''بکواس کر رہی ہو تم'' اُس نے ایک بار پھر اپنی تندی سے اپنے خوف کو زائیل کرنے کی کوشش کی ''یہ دیکھو۔۔یہ دیکھو۔۔میں اپنے جسم کی خود ایک چٹکی لے رہا ہوں''

اُس نے واقعی اپنی ایک چٹکی لی اور درد کو محسوس کر کے وہ کھلکھلا کر ہنس دیا

''ہنسو، جتنا ہنسنا چاہتے ہو'' عندلیب کا بھی ایک قہقہہ اُبل پڑا ''روح کے ہاتھ ہی روح کی چٹکی لے سکتے ہیں۔ روح ہی روح کا درد محسوس کرسکتا ہے لیکن تم اب اپنے جسم کو نہیں چھو سکتے، وہ کب کا بے جان ہو چکا ہے''

''یہ۔۔ یہ میرا جسم ہی ہے''

''نہیں۔۔ تمہارا جسم کل پولیس کو ملے گا۔ پھر تمہاری لاش، لاش گھر میں رکھی جائے گی اور تمہاری لاش کی شناخت کے لئے تمہارے فوٹو ہر اخبار میں چھپ جائینگے''

''کیوں؟'' یہ سوال اُسکے تحت الشعور میں ہی دبک کے رہ گیا لیکن خوبصورت عندلیب نے اُسکا سوال جیسے محسوس کرلیا ہو۔

''کیونکہ تمہیں یہاں میرے سوا کوئی نہیں جانتا''

''پھر ایک بکواس۔۔ اگر میں یہ مان بھی لوں کہ میری موت واقع ہو چکی ہے اور میری شناخت کا سوال بھی اُٹھ کھڑا ہوگا، تب بھی اس ہاوس بوٹ کا ایک ایک فرد، وہ ٹیکسی ڈرائیور جو مجھے دن بھر کشمیر کی سیر کراتا ہے۔ وہ سب مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں''

''کل تک انتظار کرلو۔ دیکھ لو تمہیں کوئی پہچان نہیں سکے گا۔ تم ایک لاوارث کی طرح کسی خیراتی قبرستان میں دفن کئے جاوگے۔ تمہاری ساری جاہ و حشمت تمہارے ساتھ ہی فنا ہو جائیگی اور میں۔ میں تمہاری بیوی، خود دیکھ لونگی تمہاری وہ ساری جائیداد، تمہاری وہ دولت کسی یتیم خانے کی نذر ہوتی ہوئی''

''نہیں۔۔ ایسا نہیں ہوسکتا، میری شناخت میرے ساتھ ہے''

''چہرہ شناخت کا عنوان ہوتا ہے سکندر۔ کل صبح تک تمہاری لاش کا چہرا اس حد تک بگڑ چکا ہوگا کہ کوئی تمہیں پہچان ہی نہ سکے گا'' یہ کہتے ہوئے لڑکی کا خوبصورت پیکر

جیسے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گیا

اب وہ تھا اور ہاؤس بوٹ کا وہ تنہا تنہا سا کمرا۔ باہر رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی لیکن اُسکا ذہن جیسے ماوف ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک سنسنی خیز خاموشی اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔۔۔۔

صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی اخبار کا ایک ہاکر ایک چھوٹے سے شکارے میں کچھ تازہ ترین اخبار لئے ہر اُس ہاؤس بوٹ کے ورنڈے پر اخبار پھینکتا ہوا گذر جاتا جس میں سیاح ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک اخبار ''نیو تاج ہاؤس بوٹ'' کے ورنڈے پر بھی پھینک دیا۔

سورج کی چھن چھن کرتی ہوئی کرنیں جب ہاؤس بوٹ کے اُس خوبصورت کمرے میں داخل ہو گئیں جس میں سکندر رہتا تھا تو ہاؤس بوٹ کا بیرا ایک ٹرے میں بیڈ ٹی اور اخبار لیکر اُس کمرے کی کال بل بجانے لگا۔

رات بھر کا جاگا سکندر چونک پڑا۔۔۔

وہ زندہ تھا، لیکن اُسکے سامنے رکھا گیا تازہ ترین اخبار کچھ اور بیان کر رہا تھا

''شنکر آچاریہ کی پہاڑی کے دامن میں ایک مسخ شدہ عورت کی لاش پائی گئی ہے۔ لگتا ہے کہ یہ عورت یا تو پہاڑی سے کود گئی ہے یا پھر اسے کسی نے دھکا دے کر قتل کر دیا ہے۔۔ پولیس تفتیش میں مصروف''

نیچے عندلیب کی لاش کا فوٹو چھپا تھا۔ بے شناخت چہرا۔ مسخ شدہ لاش

سکندر بس اتنا ہی سوچ رہا تھا کہ تیراں سال پہلے جس عندلیب کو اُسنے دھکا دیکر پہاڑی سے نیچے گرا دیا تھا اُس کی خبر آج کے اخبار میں کیونکر شائع ہو گئی ہے ☆☆☆

آخری صفحہ

لائبریری کے اُس تنہا گوشے میں جو پہلی کتاب اُسکی نگاہوں کا مرکز بنی اُس کتاب کا پہلا ہی ورق گم تھا۔ یا وہ لاپروائی سے کٹ گیا تھا یا جان بوجھ کر کاٹ دیا گیا تھا۔ کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں کتاب کا نام تو چھپا تھا لیکن کتاب کے مصنف کا نام اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ غالباً وہ نام، کتاب کے اُس پہلے ہی صفحے پر چھپا تھا جو سرے سے ہی غائب تھا۔۔۔ وہ اپنے شہر کی اُس ''ڈسٹرکٹ لائبریری'' میں پچھلے آدھے گھنٹے سے کوئی دلچسپ کتاب ڈھونڈنے کی سعی کر رہا تھا لیکن اس لائبریری میں یا تو اُسکی دلچسپی کی کتابیں عنقا تھیں یا پھر ممبروں کے نام اجرا ہو چکی تھیں۔

نئی خوبصورت طباعت سے مزین کتابوں کے شلف کو چھوڑ کر وہ دھیرے دھیرے لائبریری کے اُس تنہا سے گوشے میں پہنچ گیا تھا جہاں قدرے نایاب اور پرانی کتابیں کچھ بے ترتیبی سے رکھی پڑی تھیں۔ اُنہیں کتابوں میں سے اُسے یہ کتاب ملی تھی جسکے نام نے اُسے پہلی ہی نظر میں اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا'' **انجام کا عکس**''

اس کتاب پر اُسکی نظر اچانک پڑ گئی تھی اور نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگا کہ اس

کتاب میں اُسکے تمام مسائیل کا حل موجود ہوگا۔ ایک ایسے راستے کی نشاندہی ہوگی جو اُسے زندگی کے بے آب و گیاہ سے نکال کر ایک پُرسکون منزل سے ہم کنار کردے گا۔ اُس نے بظاہر اس کتاب کے مصنف کا نام جاننے کی کوشش تو کی لیکن وہ مصنف کا نام جاننے سے پہلے ہی اس کتاب کو پڑھنے کا من بنا چکا تھا اور۔۔۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ اپنے تنہا تنہا سے گھر کی ایک خوبصورت خواب گاہ میں اپنے بیڈ پر قدرے نیم دراز، ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اُس کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن جوں جوں وہ اُس کتاب کے اوراق اُلٹتا گیا توں توں اُسے ایسا لگا کہ اس کتاب کے ایک ایک حرف میں اُسکی اپنی کہانی پنہاں ہے خاصکر وہ واقعہ جب وہ شادی کے بعد اپنے گھر کو ایک نئے انداز اور نئی آرزؤوں کے ساتھ ایک جنت بنانے کا متمنی تھا لیکن اُسکی تمام تمناؤں کے محل ایک ہی جھٹکے میں تب زمین بوس ہوئے تھے جب شادی کی گہما گہمی سے چھوٹ کر اُسکی بیوی نے سرخ جوڑے میں ہی اپنے بدمزاج اور شکی القلب باطن کو عریاں کردیا تھا۔۔۔

وہ خود ایک وسیع النظر طبعیت کا مالک تھا جو زندگی کی ہر تلخ، تند اور شرین سچائی کو ایک وسیع یہاں تک کہ ایک آفاقی نقطہ نگاہ سے دیکھنے میں یقین رکھتا تھا لیکن اُسکے ساتھ ایک ایسی عورت کا وجود چپک گیا تھا جسکی نگاہ میں ہر اچھی چیز کا کوئی نہ کوئی بُرا پہلو تھا جو خود تو ایک آزاد فضا کی متلاشی تھی لیکن جسکے لئے دنیا ''آفاقی'' وسعتوں کے بجائے تنگ نظری کی اسیر تھی۔۔۔ اور یہی سے اُس گھر کی چاردیواری میں تضاد کے شگاف پڑنے شروع ہوگئے تھے۔ اس گھر کے ہر کمرے کا سکون مکڑے کی جالیوں پر لٹکتا ہوا دم توڑنے لگا تھا۔۔ ابتداً وہ اپنی تنگ نظری اور تند مزاجی کا اظہار حرکات وسکنات سے کرتی رہی لیکن

دھیرے دھیرے اُس نے اپنی زبان کے اژدھے سے ڈنک مارنے شروع کردیئے۔ اُسکی زبان سے اتنا زہر ٹپکنے لگا کہ گھر میں کئی مہینوں سے میٹھے بول بولنے والا طوطا بھی ایک دن اپنے پنجرے میں لال لال چونچ سے سفید جھاگ ٹپکاتا ہوادم توڑ بیٹھا۔

یہی زہر اُسکی کتابِ زیست کے ہر صفحے پر بکھرا پڑا تھا۔حد یہ کہ اُس کتاب کا ہر منظر اُسکی زندگی کا کوئی نہ کوئی عکس پیش کررہا تھا۔ایک منظر میں وہ رسوئی گھر کے ہر برتن کو پٹک کر ایک خوبصورت مکان کی ایک ایک اینٹ کواُکھاڑنے کا عزم کرچکی تھی

''تم زندگی کو ایک خواب سمجھتے ہواور مجھے اس گھر کی لونڈی!''

''میں تمہارے ساتھ زندگی کا ہر خواب پورا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور میں نے ہمیشہ تمہیں اس گھر کی مالکن کا ہی درجہ دیا ہے''

''عنوان تو تمہاری جیب میں پڑے رہتے ہیں لیکن خوبصورت لفافے میں ماتمی خط کا متن نہیں بدلتا''

''اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے تم اپنے ہی سکون کو کیوں درہم برہم کرنے پر تلی ہو''

'' میرا سکون تو اُسی دن چھن گیا تھا جب میں نے اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔۔یہ گھر میرے لئے ایک قبر ہے'' وہ پھنکار مارنے پر بضد تھی اور ان لمحات میں عموماً اُسکے ذہن میں دو ہی لائینیں اُبھرنے لگتیں۔یا خاموش رہنا یا پھر راہ فرار اختیار کرنا اور اکثر وہ دوسرا راستہ ہی چن لیتا تھا کیونکہ اُسکے روبرو خاموش رہ کر بھی اُسکے رگ و پے میں سرائیت کرتے ہوئے زہر کے اُبال کو کم نہیں کیا جاسکتا تھا۔۔یوں وہ پھنکارتی رہتی اور اُسکے پھنکارنے کی آواز تب تک اُسکے کانوں میں گونجتی رہتی جب تک وہ

صوت وصدا ع کی سرحدوں سے دور نہ نکل آتا۔

آج وہ ایک خاموش رات کے دوسرے پہر میں ''انجام کا عکس '' دیکھنے کے لئے کتاب کے اوراق ایک موہوم سی اُمید کے ساتھ پلٹ رہا تھا۔ اس کتاب کا ایک ایک ورق اُسے انجامِ زیست تک پہنچنے کے لئے بے چین کر رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ کتاب اُسکی ہی زندگی کا عکس ہے، اتفاقاً یا معجزاتی طور، اس کتاب کے مصنف نے ہو بہو اُسکی زندگی کے ہر ایک گوشے کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا تھا اور وہ اپنے ان بکھرے لمحوں کو سمیٹ کر ایک انجام کی تلاش میں اپنے گردو پیش سے بھی بے نیاز تھا،۔ ویسے بھی اب اُسکے گردو پیش میں کوئی نہیں رہتا تھا، اُسکا تنہا تنہا سا گھر اب فقط اُسکی بے چین اور جاگتی راتوں کا مسکن بنا تھا۔۔۔

وہ۔۔ جو زندگی بھر کا ساتھ دینے کی قسمیں کھا کر، ساز و سنگار کی تمام تر نزاکتوں کا دامن تھامے اُسکی دہلیز پر نئی امیدوں اور آرزوؤں کے چراغ روشن کرنے کے لئے بڑے تزک و احتشام سے لائی گئی تھی اُسنے ایک سیاہ بدنما فیصلے کی دبیز چادر اوڑھ کر رات کی تاریکی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دہلیز سے اپنے آپ کو ہی الگ کر لیا تھا۔۔

کتاب کے آخری باب سے پہلے اُس رات کا سناٹا ایسے طاری تھا کہ کتاب کے الفاظ بھی بظاہر ماتم کناں تھے

''رک جاو۔۔۔ ایک عورت کا گھر ہی اُسکے تقدس کا ضامن ہوتا ہے'' اُسے اپنے اندر دور کہیں گہرائیوں میں اپنی ہی چیخ سنائی دی

''مجھے کسی تقدس کی صلیب پر اپنی آزاد زندگی کو قربان نہیں کرنا ہے۔۔ میں جا رہی ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ تمہارے دیئے ہوئے سارے رشتے اور اُن رشتوں کے

نام اپنے پیروں تلے کچل کر۔۔'' اُسنے آخری ڈنک مارا تھا اور پھر پورے گھر میں ایک پُر اسرار خاموشی چھا گئی تھی جو دور ایک گاڑی کے جانے کی آواز کے ساتھ ہی اور گہری ہوتی چلی گئی۔۔۔

اُس باب کی آخری سطریں رونا چاہتی تھیں لیکن نہ جانے کیوں اُسنے کتاب کی پلکیں بند کر دیں اور آنسو صفحوں میں جذب ہو کر رہ گئے۔۔۔ اتنے سال۔۔۔ نہ شناسائی نے دوستی کی قبا اوڑھ لی اور نہ ہی دوستی نے اجنبیت کا کفن ہی اوڑھ لیا۔۔۔

رشتے مر جاتے تو آدمی زندگی کی بہت ساری بندشوں، مجبوریوں اور اذیتوں سے بچ جاتا لیکن رشتوں نے شاید اپنے مقدر میں ''فنا'' کا لفظ لکھوانا قبول ہی نہیں کیا ہے۔ یہ تو انسان ہی ہے جو دنیا کا ہر حرف خود ہی اپنی لوح مقدر میں لکھ دیتا ہے اور جب اُن میں سے ہی کوئی لفظ اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ اُسکے سامنے سراپا پیکر بن کر اُسے اذیت ناک لمحوں کا اسیر بنا دیتا ہے تب وہ اپنے نصیب کو کوستا ہے، اپنی زندگی کی کتاب سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتا ہے

وہ بھی اب اس کتاب سے آنکھیں چرانے کی جستجو کر رہا تھا لیکن آنکھوں کا ساتھ دل نہ دے سکا۔ تجسُس کا تیر دل کو گھائل کر چکا تھا۔ وہ ایک ایسے حال میں پہنچ چکا تھا جہاں خود اُسے اپنے اوپر کوئی دسترس حاصل نہ تھی۔۔۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی دست شناس ماضی کی تمام تر صحیح باتیں بتا چکا ہو اور اب ہاتھ پھیلائے منتظر شخص اپنا مستقبل جاننے کے لئے بے تاب ہو۔۔۔

اُسے بھی اپنا مستقبل جاننے کی چاہ تھی۔ اس لئے اُسنے پھر اُس کتاب کے چہرے سے نقاب اُلٹ دی۔۔ لفظ پھر بولنے لگے۔۔ مقدر کی ایک ایک لکیر عریاں

ہونے لگی۔۔ ماضی اور حال کے ان گنت موڑ زندگی کے سفر میں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔۔سامنے ایک انجان راستہ تھا۔۔۔ کتاب کے آخری صفحے پر ایک عجیب منظر تھا

وہ کتابِ زیست کا انجام جاننے والا اسقراط کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ چھین کر پی رہا تھا اور اُسکے عقب میں ایک اژدھا پھن پھیلائے حیرانگی اور مایوسی کے عالم میں پتھر بن چکا تھا

دوسرے دن یہ خبر پورے شہر میں پھیل چکی تھی کہ کالج کا ایک ذہین اور قابل پروفیسر اپنے ہی کالج کی لائبریری میں مردہ پایا گیا☆☆

وفا

وہ سرکس کا Lion Master ہوتے ہوئے بھی سرکس کے مالک کا مقروض نوکر تھا اسی لئے ایک معمولی غلطی کے عوض بھاری مار کھا بیٹھا۔ اُس کے ہونٹوں سے اُف تک بھی نہ نکلی لیکن قریب رکھے پنجرے میں پڑا شیر اپنے ماسٹر کی حالت پر دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔

چند لمحوں کے بعد ماسٹر نے اپنے نحیف اور لہولہان ہاتھوں سے شیر کو آزاد کر دیا شیر اپنے ماسٹر کے قدموں پر لوٹنے لگا۔ ماسٹر کی آنکھیں اپنے سدھائے ہوئے شیر کی ہمدردی سے چھلک آئیں اور اُس کا دل چیخ اُٹھا۔

''میرے ساتھی، میں تڑپ رہا ہوں۔ مجھ سے یہ درد برداشت نہیں ہوتا۔ میرے دوست میرے لئے کچھ کرو۔ میرے لئے کچھ کرو تا کہ مجھے اس درد سے نجات مل جائے''

شیر نے قدرے توقف کے بعد، سوچ کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر اپنے ماسٹر کی نجات کے لئے عملی دعا کی۔

چند لمحوں کے بعد۔۔۔ اُس کا ماسٹر دم توڑ چکا تھا اور شیر آنکھوں میں آنسو لئے اپنے ہونٹوں سے اپنے ماسٹر کا خون پونچھتا ہوا اُسکی موت کا ماتم منا رہا تھا۔

☆☆

......اور ساز تھم گیا

پھر وہی آہٹ لیکن اب کی بار بجلی کے بلب نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ کمرے کا وجود روشنی میں عریاں سا ہو کر رہ گیا....وہ آنکھیں پھاڑ کر کمرے میں کسی ذی روح کو جیسے تلاش کرنے لگا لیکن کمرہ خالی تھا اُسکے دل کے نہاں خانوں کی طرح...وہ اپنے بیڈ پر اکیلا سویا تھا.....

تین سال سے..وہ آواز..اُن پازیبوں کی میٹھی جھنکار..اُسکی راتوں کی بے چینی اور بستر کی شکنیں...ہر رات وہ ذہن کی اُلجھنیں سلجھانے میں گزار دیتا تھا، ایک انجان سی اُمید کے سہارے۔

ایک سال بعد....

اُس رات وہ بے صبر انتظار میں جذبات اور خواہشات کے طوفان میں ہچکولے کھاتا رہا اور جب صبح کی کرنوں نے دبیز ریشمی پردے سے جھانکتے ہوئے اُسے شب بخیر کہا تو وہ چونک کر بستر سے اُٹھ بیٹھا...وہ بے تاب نگاہوں سے کمرے کا جائیزہ لینے لگا جیسے وہ اُسکی اپنی خواب گاہ نہ ہو..جیسے وہ عالم خواب میں ہی کہیں اور پہنچا ہو لیکن..

وہ اپنے پہلو میں میٹھی نیند کے جھولوں میں جھولتی ہوئی اپنی بدصورت شریک حیات کو دیکھ کر حیرت کے آسمان سے نیچے گر پڑا۔۔۔

باہر خاموشی چھائی تھی جیسے قدرت کا ہر خوبصورت ساز تھم گیا ہو۔ ☆☆

نجات

وہ یہاں کیسے پہنچا تھا یہ ایک لمبے سفر کی لمبی کہانی تھی۔ وہ خود اُس کہانی، اُس کہانی کے سبھی کرداروں اور اُس سفر کی مجروع ساعتوں کے درد کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اُسنے یہاں پہنچے سے پہلے بھی اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانے کی بے سود کوشش کی تھی لیکن وہ اس معاملے میں اتنا بے بس تھا کہ اُسے اپنے شہر میں کوئی ایسا ہمنوا بھی نہ ملا جس کے ساتھ وہ دو پل گزار کر اپنے ماضی کی تلخیوں سے نجات پالیتا۔ اور یوں جب حالات نے اُسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تب بھی اُسکا ماضی اُسکے دامن سے لپٹا رہا، موت کے خوف کی طرح۔

اب وہ یہاں تھا، یہاں، ایک اجنبی شہر میں، جہاں اب کوئی نہیں مرتا۔ جو یہاں آتا ہے وہ ہمیشہ یہیں کا ہو کے رہ جاتا ہے چاہے وہ کتنا ہی لاغر، کمزور اور بوڑھا کیوں نہ ہو جائے۔ اُس نے اس شہر کے ہر باشندے کو موت سے بے پرواہ دیکھا اور یوں کچھ دیر کے لئے وہ بھی سکون کی چند سانسوں کو اپنی رگ و پے میں محسوس کرنے لگا۔

اُسنے کچھ دنوں کے بعد یہ کہانی بھی سن لی کہ بہت پہلے شاید ایک آدھ صدی قبل اُس شہر کے چند بہادر جیالوں نے موت کو بیچ چوراہے پر قتل کر دیا تھا۔ حالانکہ اُسے قتل کرتے کرتے اُن جیالوں میں سے کچھ نوجوان خود بھی موت کا شکار ہو چکے تھے لیکن اُن

کے اجسام اس شہر کی سڑکوں سے گذرنے والے آخری جنازے کا عنوان بنے۔ اُنہیں بڑی شان کے ساتھ دفنایا گیا تھا۔ اُن کی قبر پہ سنگ مرمر کے خوبصورت کتبے، خوبصورت تحریروں کے ساتھ آج بھی اُن کی شان میں قصیدہ گو تھے۔ اُن قبروں کا دیدار اُسنے بھی ایکدن کیا۔ ٹھیک اُن قبروں کے قدموں کے پاس ایک اور قبر تھی۔ بظاہر کافی بڑی لیکن قدرے خستہ حال اور کہنے والوں کا کہنا تھا کہ وہ موت کی قبر ہے۔ اُس موت کی جسے ان نوجوانوں کے طفیل بیچ چوراہے پر قتل کردیا گیا تھا۔

اسی اجنبی شہر میں اب وہ اپنے ماضی کے ساتھ وارد ہوا تھا موت کے ڈر کی وجہ سے۔ یہاں اُسے اگرچہ موت کے خوف سے نجات ملی تھی لیکن اُسے یہ خدشہ بھی لاحق لگا رہتا تھا کہ کہیں اُسکا ماضی اُسے اس شہر کے چوراہے پر سنگسار نہ کروادے۔ وہ جانتا تھا کہ اس شہر میں اُسکی سزا، سزائے موت نہیں ہوسکتی لیکن وہ زندان کے عذاب سے جسم و جان کی اذیتوں تک کسی بھی احساس کا تصور کرکے ہی کانپ اُٹھتا تھا اور اُسی تصور کو حقیقت سے دور رکھنے کے لئے وہ اکثر سفید اُجلے کپڑے پہننے لگا تھا تاکہ کوئی اُسکی روح کا داغ داغ دامن نہ دیکھ سکے۔ وہ ہر رات پلکوں کے بوجھل ہونے سے پہلے اپنے ماضی سے نجات کی دعائیں بھی مانگنے لگا تھا اور اُن لمحات میں نہ جانے کیوں اُسکا ماضی بھی دور ایک کونے میں خاموش، اُسکا تماشہ دیکھتا رہتا جیسے اُسکی بے چارگی، لاچاری اور تسکینِ قلب کی تلاش کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ وہ دعائیں مانگنے کے بعد بظاہر کچھ دیر کے لئے پُرسکوں نیند کی آغوش میں چلا جاتا لیکن جب اُسکا ماضی اُسکے خوابوں میں آکر اُسکے سکون کو درہم برہم کردیتا تو وہ رنج ومحن کی اذیتوں کا قیدی بنا رہتا، سحر ہونے تک۔

اُسکے سارے دن پُرکیف لمحات کے متلاشی رہتے۔ اب اُسنے لوگوں کی

خدمت کو اپنا شعار بھی بنالیا تھا یہ جان کر کہ شاید یوں اُسے اپنے شاندار مستقبل کی کوئی راہ اچانک اُسی طرح مل جائے جس طرح اُسے اس عجیب شہر کا راستہ مل گیا تھا اچانک اور غیر متوقع۔ اسی کشمکش، اسی اُمید اور ان ہی خوابوں کے سہارے کئی ماہ و سال بیت گئے۔ اُس نے ان برسوں میں اگر چہ انجانے خوف سے نجات حاصل نہیں کی تھی لیکن اپنی زندگی کے کچھ Relaxed لمحوں سے اپنے اردگرد کے ماحول کو نہ صرف اپنا ہمنوا بنا دیا تھا بلکہ اب وہ اس شہر کے چند معززین میں بھی شمار ہونے لگا تھا۔

آج اُنہیں شہریوں کا ایک عظیم الشان اجتماع ہونے والا تھا۔ اُسے بھی ایک خوبصورت دعوت نامے نے اپنی اہمیت کا احساس دلایا تھا اور وہ آج سویرے سے ہی ایک قد آدم آئینے کے سامنے اپنے آپ کو اور زیادہ پُر وقار اور پُر جلال بنانے کی سعی کر رہا تھا کہ اچانک اُسے آئینے میں اپنے عکس کے بجائے اپنے ماضی کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ تلملِا اُٹھا۔

آج اُسکا اپنا ماضی اُسکے زخموں کو کرُیدنے کی قسم کھا چکا تھا اسی لئے آئینے میں اُس لمبی کہانی کا وہ منظر منعکس تھا جسے وہ یاد کرنے کی بھی جرأت نہیں کر پاتا تھا۔

منظر میں، ایک درمیانہ عمر کی ماں سے اُسکا نوجوان بیٹا مخاطب تھا

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو ماں۔۔۔ کیا میں تمہارا بیٹا تمہارے اور اپنے بارے میں کوئی غلط فیصلہ لے سکتا ہوں"

"بیٹے۔۔ مجھے تمہارے فیصلے کی نہیں بلکہ تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔۔ تم مجھے اس چھوٹے سے گھر سے نکال کر جس بڑی حویلی میں لے جانا چاہتے ہو وہاں تمہاری ماں کو کچھ دنوں تک عزت تو ملے گی لیکن پھر۔۔۔"

''نہیں ماں نہیں ۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ ایک رحمدل سیٹھ ہے جو ایک جوان، خوبصورت اور بن ماں کی بیٹی کا باپ ہے۔ کیا پتہ ہم دونوں کی محبت اور اپنائیت آج کے اس معمولی تعلق کو کل کسی رشتے میں بدل دے۔ اور میں اُس گھر کا داماد بن جاؤں''

''بیٹے تم بچپن سے ہی بڑے بڑے خواب دیکھتے آرہے ہو حالانکہ تم خود جان چکے ہو کہ ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے خواب بھی پورے نہیں ہوتے۔ اب ہم ایک اور خواب کے لئے کیوں اپنی باعزت زندگی داؤ پہ لگادیں''

''او۔ ماں۔۔ تم خواب بُننے سے پہلے ہی وہم کو اپنی آغوش میں پناہ دیتی ہو، میں اُس حویلی کی ایک ایک نس سے واقف ہو چکا ہوں، میں نے حویلی کے مالک کی کمزور رگ پر ہاتھ بھی رکھ دیا ہے تبھی تو وہ مجھے اپنی ماں کے ساتھ عمر بھر کے لئے اپنانے کو تیار ہے''

''بیٹے، ضد سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ تم اگر مجھے سمندر میں بھی ڈوبنے کے لئے کہو گے، میں اُس میں بھی غرق ہونے کے لئے تیار ہوں لیکن میری بس اتنی سی تمنا ہوگی کہ تمہاری کشتی کنارے لگ جائے''

''نہ کوئی ڈوبے گا ماں اور نہ ہی کسی کشتی کے مقدر میں بھنور لکھا جائے گا۔ موقع ایک بار دروازے پہ دستک دینے آتا ہے، ہمیں اس دستک پہ اپنا دروازہ کھول دینا چاہئے''

''جو تمہاری مرضی بیٹا۔۔ میں نے جو کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا''

ماں اس کے بعد خاموش ہوگئی تھی، عمر بھر کے لئے خاموش۔۔ وہ تب بھی کچھ نہ بولی جب اُسکے اکلوتے بیٹے کو حویلی کے سیٹھ نے بری عادتوں کا شکار بنا دیا۔

وہ تب بھی تڑپ تڑپ کے خاموش ہوگئی تھی جب بوڑھے سیٹھ نے اُسکی پاکیزگی کو تار تار کر دیا تھا۔

اور۔۔۔ وہ تب بھی خاموش ہی تھی جب اُسکی نعش کو چوری چھپے ایک کنویں میں پھینک کر اُسے خودکشی کا عنوان عطا کیا گیا تھا۔لیکن۔۔۔

آج اُسکے سامنے اُسکا آئینہ بول رہا تھا اور اُسے یوں لگا کہ ایک جانب جہاں آئینے نے اُسے اپنے ہی سامنے عریاں کر دیا تھا وہاں خود یہ روح فرسا مناظر دیکھ کر آئینے کا سینہ بھی چھلنی ہوگیا تھا۔آئینے کی کرچیں بکھر گئیں اور اُسے آئینے کی روح لہولہاں ہوتی ہوئی نظر آئی۔

وہ اپنے کمرے میں ہانپنے لگ گیا۔اب آئینے کے ہر ایک ٹکڑے میں اُسے اپنے سیاہ ماضی کا ایک ایک منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ایسے ہی ایک ٹکڑے میں اُسکی لمبی کہانی کا وہ آخری منظر بھی عیاں تھا

اب اس منظر میں وہ ماں کی جدائی کا معاوضہ مانگ رہا تھا۔اُسکے چہرے پر اب غصہ، ندامت اور بغاوت کے مختلف رنگوں نے ایک دوسرے میں مدغم ہوکر ایک نئے ہی رنگ کو جنم دیا تھا لیکن اس سب کے بدلے میں اُسے ایک سزا ملی۔حویلی کے بوڑھے سیٹھ نے اُس کے پیچھے حویلی کے جوان سیاہ اور وحشی کتے چھوڑ دیئے اور وہ اُن کتوں سے بچنے کے لئے اپنے شہر کی اندھی اور سیاہ گلیوں میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔۔نہ جانے کتنے دن، کتنے ہفتے، کتنے ماہ اور کتنے سال کہ اچانک اُسے اس اجنبی شہر کا راستہ مل گیا جہاں موت کو ایک یا آدھ صدی قبل قتل کر دیا گیا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس شہر کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہی اُسکے پیچھے بھاگتے ہوئے کتوں کے قدم بھی رک گئے۔اُنکی باہر نکلی

ہوئی اور رال ٹپکتی ہوئی زبانیں اُنکے اپنے ہی دہانوں میں غائب ہوگئیں اور وہ سارے کتے خفت زدہ، مایوس اپنی جگہ پہ ہانپتے رہ گئے۔

وہ کرچوں کی دنیا میں اپنی سانسیں سمیٹنے لگا اور اچانک وہ اپنے اس کمرے سے بھاگ گیا جس میں اُس کا ماضی ٹکڑوں میں بکھرا ہوا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ اپنی بے قرار دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے، اپنے اُجلے سفید لباس کی شکنیں درست کرتے ہوئے جب اُس عظیم الشان اجتماع میں پہنچا تو زندگی میں پہلی بار اُسے ایسا محسوس ہوا کہ آج اُسکے دامن سے اُسکا ماضی لپٹا ہوا نہیں ہے۔

کچھ دیر بعد وہ اجتماع کے اہم ترین ایجنڈے کی جانب متوجہ ہوا۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ عجیب وغریب شہر کس مصیبت کا شکار ہو چکا ہے۔ اجتماع کا صدر پریشان لہجے میں شہریوں سے مخاطب تھا

''آپ سبھی جانتے ہیں کہ اس شہر کی آبادی دن بدن بڑھ رہی ہے، لوگوں کے پاس اب سر چھپانے کے لئے جگہ نہیں۔ بیمار اور لاغر لوگ اب سڑکوں اور چوراہوں پر ڈیرا ڈال چکے ہیں۔ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے چادر اور چاردیواری کا مسئلہ سانپ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا ہو چکا ہے اس لئے ہم آج یہاں جمع ہو کر یہ فیصلہ لینے پر غور کرنے والے ہیں کہ اس شہر کے وسیع ترین قبرستان کو ایک آباد بستی میں تبدیل کیا جائے۔''

مجمے میں کانا پوسی شروع ہوئی۔ سب یوں تو اس بات پہ متفق تھے کہ اس شہر کو اب برسوں سے قبرستان کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن قبروں کو ڈھا کر عمارتیں تعمیر کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ چار قبریں تھیں جن میں اُن نوجوانوں کو دفن کیا گیا

تھا جنہوں نے ایک معرکتہ الآرا تاریخ رقم کر کے موت کو بیچ چوراہے پر قتل کر دیا تھا۔

عام و خواص اُن قبروں کے لئے فکر مند تھے جبکہ اُنہیں اپنے آبا و اجداد کے مقبروں پر عمارتیں کھڑی کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔۔ کچھ لوگ یہ خدشہ بھی ظاہر کرنے لگے تھے کہ اُن نوجوانوں کی قبروں کے ساتھ ساتھ موت کی قبر کو بھی چھیڑا نہیں جا سکتا کیا خبر کون سی بلائے آسمانی پھر اس شہر کو اپنی لپیٹ میں لے اور لوگوں کو ایک اذیت ناک زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑے۔

یوں سارے اجتماع پر ایک سکوت طاری ہونے لگا۔ ہر ایک اپنی اپنی سوچ کے سمندر میں جیسے غرق ہو گیا۔ سر سے سر جڑ گئے، لفظ سے لفظ ٹکرانے لگے اور آخر میں اکثریت نے یہ رائے دی کہ لوگوں کو ننگے آسمان کے رحم کرم پر بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ چادر اور چار دیواری کا انتظام ناگزیر ہے۔

جب یہ فیصلہ صاحب صدر سنا رہا تھا تب۔۔۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا۔ شہر کے سب ذی عزت لوگوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر۔

کچھ دیر کے بعد اُسکے قدم واپس اُس شہر کی طرف جا رہے تھے جہاں موت اب بھی زندہ تھی ☆☆

کتبہ

''چلی جاؤ۔۔۔ یہاں آنے والا بھی خالی آتا ہے اور جانے والا بھی خالی جاتا ہے۔۔ جاؤ اس سے پہلے کہ مجھے اپنے خالی ہاتھوں کے سامنے پھیلی ہوئی تمہاری اس خالی جھولی کا احساس نشتر چبھو دے، تم یہاں سے چلی جاؤ۔''

''یہ کیا؟.. تمہارا چہرا اُتر گیا اور تمہاری جھولی اور پھیل گئی۔ کیا میری باتوں پہ یقین نہیں آتا۔ سنو.. میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ ہاتھ تب بھی خالی تھے اور آج بھی خالی ہیں دیکھتی نہیں ہو اس بے بسی کے مزار کے پر کوئی فاتحہ پڑھنے کے لئے بھی نہیں آتا، تم نادان ہو، چلی آئی یہاں.. میں تو اب کسی کو پکارتا بھی نہیں، میرے اندر اب کوئی احساس ہچکولے بھی نہیں کھاتا۔۔ بہت عرصے تک تمہاری راہ دیکھتا رہا لیکن اب میری آنکھوں کو بھی کیڑے مکوڑے نوچ کر مجھے انتظار کی تڑپ سے آزاد کر چکے ہیں۔۔ اب میرا دل بھی تمہیں نہیں پکارتا۔۔ وہ گوشت کا لوتھڑا تو تمہاری ہی دنیا میں اپنی آخری دھڑکن چھوڑ چکا ہے۔ اب میں تمہیں یاد نہیں کرتا۔۔ کیوں اپنی زندگی کو ایک جھوٹ کے سہارے گزارنا چاہتی ہو کہ کوئی مر کر بھی تمہیں چاہتا ہے۔ یہاں چاہنے اور بھول جانے کے الفاظ ہی کہیں نظر نہیں آتے۔۔ جاؤ خدارا چلی جاؤ۔۔ مجھے میرے آخری مسکن میں سکون کی نیند سونے دو۔۔ بہت جاگا ہوں میں تمہاری دنیا میں''

چند لمحوں کے بعد ایک جوان خوبصورت لڑکی ہزار دھڑکتے دلوں کو سکون پہنچانے والے قبرستان سے نکل رہی تھی.....ایک اجاڑ قبر پر پھول رکھنے کے بعد☆☆ ☆

آنگن

وہ اُس گھر کی چوکھٹ سے یوں تو باہر تھا لیکن اُس گھر کی ہر ایک بات سے باخبر تھا کیونکہ وہ اُس گھر کے ساتھ برسوں سے جڑا ہوا تھا۔ اُس گھر کے ہر دکھ سکھ میں اُس کا ساتھی اور شاہد رہا تھا۔ وہ اُس گھر کی کتاب کا پہلا صفحہ تھا جس پر اُس گھر میں چھائی ہوئی مایوسیوں کی کالی دھندلی لکیریں بھی منعکس تھیں اور جدوجہد، محبت، اپنائیت، یگانت کے خوبصورت رنگ بھی۔ وہ اِس گھر کے دولہے کا سہرا بھی دیکھ چکا تھا اور اِس گھر میں آئی ہوئی دلہن کے پہلے قدم کو بھی اُسنے اپنی پلکوں پہ جگہ دی تھی۔ ساز و سنگیت کے سروں سے اور پھولوں کی برسات سے اُسنے اِس گھر میں آئی ہوئی خوبصورت دلہن ساجدہ کا استقبال بھی کیا تھا اور اس گھر سے براتیوں کے ہمراہ خوبصورت سہرا باندھے اکرم میاں کو بھی اُسنے جی بھر کے دعائیں دی تھیں۔ وہ اس گھر کا بھیدی بھی تھا اور اس گھر کا ساتھی بھی۔ اُسنے اپنی گود میں اِس گھر کی تین خوبصورت، معصوم اور پیاری پیاری سی بچیوں کو بھی کھلایا تھا۔ اُسنے جہاں بدلتے بگڑتے موسموں کا مزاج بھی سہا تھا وہاں تین بچیوں کی سالگرہ پہ سالگرہ بھی دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے منائی تھیں کیونکہ وہ اس گھر کا آنگن تھا۔ ایک

ایسا آنگن جو گھر کے اندر اُبھری ایک ہلکی سی ہنسی کے ساتھ ہنستا ہے اور ایک ہلکی سی سسکی کے ساتھ روتا ہے۔

یہ آنگن سب کچھ جانتا ہے۔ اُسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ ساجدہ اور اکرم صاحب اگر چہ اپنے گھر میں تین خوبصورت بیٹیوں کی وجہ سے کافی خوش ہیں لیکن کبھی کبھی ایک بیٹے کی چاہ بھی اُنہیں اندر ہی اندر کُریدتی رہتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُن کی تینوں بیٹیاں تانیہ، رقیہ اور شائستہ اپنے والدین سے اتنا پیار کرتی ہیں کہ اگر کبھی کوئی مذاق میں بھی اُن کی شادی یا رخصتی کی بات کرتا ہے تو وہ گھنٹوں رونے لگتی ہیں۔ اسی لئے شاید بیٹیوں کی شادی کی فکر ہوتے ہوئے بھی اکرم اور اُسکی بیوی ساجدہ اپنی بیٹیوں کے سامنے اب کھل کے شادی کا ذکر نہیں کرتے تھے لیکن آنگن جانتا تھا کہ اُن کو رخصت کرنے کے سامان چپکے چپکے مرتب ہو رہے تھے۔

اکرم صاحب خود ایک انشورنس کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدے پہ فایز تھے، خوش گفتار اور حلیم جبکہ اُن کی بیوی ساجدہ جو ایک کالج میں اردو کی پروفیسر تھی۔ نظم وضبط کی پابند خاتون ہونے کے ساتھ بیٹیوں کے بارے میں بھی ہر لمحے فکرمند رہتی تھی اور ایسی ہی فکر کا مرکز وہ آنگن بھی تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہی اُداس ہو جاتا تھا کہ ایکدن یہ معصوم پیاری پیاری۔۔ پریاں ایک ایک کر کے اُسے وداع ہو جائینگی اور وہ، اکرم صاحب اور ساجدہ جی پھر کیسے جی پائینگے۔۔۔؟

تینوں بہنیں بڑی خوش مزاج تھیں، ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والی لیکن کبھی کبھار بڑی بہن تانیہ سنجیدگی کا دامن تھام کر اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کو زندگی کے نشیب و فراز سمجھنے کی ترغیب دیتی تھی۔ اُس وقت آنگن کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اُن کی بڑی بہن نہیں

بلکہ اُن کی ماں ہے۔

آنگن جانتا تھا کہ اُسکے اردگرد کھڑی کی گئی اونچی اُونچی دیوار سے اس گھر کی جانب اُٹھنے والی غلط یا اجنبی نظروں کو روکا جاسکتا ہے لیکن وقت کی گذرتی ہوائیں بھلا کسی حصار یا دیوار سے کہاں رکتی ہیں۔ وہ ہوائیں کب اس آنگن سے گذر کر گھر کے اندر داخل ہوگئیں یہ آنگن کو بھی پتہ نہ چلا۔ ایک دن تانیہ کا خوبصورت دولہا براتیوں کے ساتھ آنگن کے سینے پر بچھے ہوئے پھولوں کو روندتا ہوا اُس سنجیدہ پیاری پیاری سی تانیہ کو خوبصورت لمبی کار میں بٹھا کر لے گیا۔۔ اُس رات آنگن کو پہلی بار لگا کہ اس گھر کی عمارت میں ایک دراڑ پڑ چکی ہے۔ اُسے خود اپنا سینہ پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کے ساتھ ساتھ گھر کا ہر فرد اپنے اپنے کمرے میں اُداس اُداس اور تنہا تنہا سا دکھائی دینے لگا۔۔ اُس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ تانیہ کی رخصتی کے بعد ہفتوں تک اس گھر کا کوئی بھی فرد پوری رات اپنے اپنے کمرے میں نہیں سویا۔ رقیہ اور شایستہ تو رات رات بھر اپنی دیدی کی ہی باتیں کرتی رہتی تھیں جبکہ ساجدہ اور اکرم کی زبانوں پر جیسے خاموشی کے تالے لگ چکے تھے۔ اُن کا دل اندر سے تو رو رہا تھا لیکن اُن کی آنکھوں کی چلمن سے کوئی بھی آنسو جھانکنے کی جرأت بھی نہیں کر پایا یہ سوچ کر کہ کہیں یہ قطرہ سارے گھر کو جذبات کے سمندر میں بہا کر نہ لے جائے اور یوں دھیرے دھیرے اس گھر کے ہر فرد نے اپنے زخموں کو مندمل ہونے کی مہلت دینی شروع کی لیکن۔۔۔

جب ایک دن تانیہ اپنے سسرال سے کچھ دیر کے لئے اس گھر میں آئی تو اُس آنگن نے بھی اُسکے چہرے پہ چھائی ہوئی تنہائی کی لکیروں کو صاف پڑھ لیا۔ اُس کا شوہر عرفان، ایک انجینیر تھا اور ایک بات اگرچہ تانیہ نے چپکے چپکے اپنی ماں کو ہی بتائی تھی

لیکن آنگن کے کان نہ چاہتے ہوئے اُس راز سے آگاہ ہوئے کہ وہ ایک راشی آفیسر تھا۔ پیسوں سے دن رات پیار کرنے والا ایک ایسا نوجوان جو یہ سمجھتا تھا کہ دنیا کی ہر خوشی پیسے سے ہی خریدی جاسکتی ہے۔ حالانکہ آنگن کو معلوم تھا کہ تانیہ کس ماٹی سے بنی تھی۔ وہ اُس اکرم اور ساجدہ کی بیٹی تھی جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی اس گھر کے آنگن میں کوئی ایسا پیسہ لے کر قدم نہیں رکھا تھا جو غلط راہوں پہ چل کے حاصل کیا گیا ہو۔ تانیہ کا یہ دکھ آنگن کے ساتھ ساتھ اکرم اور ساجدہ کو بھی ایک تیر کی طرح چُبھ گیا اور اکرم نے بڑے پیار سے اپنی بیٹی کو سمجھا دیا کہ وہ اپنے شوہر کے خیالات کو بدلنے کی دانشمندانہ کوشش کرے۔

تانیہ اُس دن کے بعد مہینوں تک پھر کبھی دکھائی نہ دی لیکن اُس دن جب وہ آگئی تب رقیہ کے جانے کی بھی باری آگئی تھی۔ اور یوں آنگن کو رقیہ کی وداعی کا وہ منظر بھی دیکھنا پڑا جسے دیکھنے کے بعد اُسے یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اب اکرم میاں، ساجدہ جی اور شایستہ جدائی کا غم نہ سہہ پائینگی۔ لیکن اب کی بار آنسوؤں نے شائد اُن کے غم کو ایسا ہلکا کر دیا کہ آنگن کے ساتھ ساتھ وہ سب یہ صدمہ برداشت کر سکے۔ زندگی کچھ دنوں کے بعد پھر معمول پر آگئی۔ تانیہ نے بھی اس دوران سسرال کی کسی شکایت کا ذکر نہ کیا لیکن آنگن نے اُسے چپکے چپکے آنسوؤں چھپاتے ہوئے رخصت ہوتے ہوئے دیکھا تھا اکیلے اکیلے کیونکہ اُس کا ناخدا زیست کی ناؤ میں سوار مال و دولت کے سمندر میں نہ جانے کس جانب رخت سفر باندھ چکا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد رقیہ اپنے شوہر عادل کے ساتھ جب پہلی بار اپنے میکے آئی تو آنگن کو اُن دونوں کے چہروں پر پیار اور اپنے پن کی چمک دیکھتے ہی ایسا لگا کہ برسوں

کے بعد اُسکے دامن میں لگی ہوئی پھولوں کی کیاریوں میں بہار آئی ہو۔ یہی شگفتگی اکرم صاحب کے گھر کے ہر فرد کے چہرے پہ بھی اپنی خوشبو بکھیرتی ہوئی دکھائی دی۔۔۔اس نو بیاہتا جوڑے نے اُس دن اس گھر کے ساتھ ساتھ سارے آنگن کو بھی اپنی خوشیوں سے مالا مال کر دیا۔ دوسرے دن وہ اپنی خوبصورت کار میں سب کی دعائیں لے کر چل دئے اور ہنستا مسکراتا آنگن اُنہیں دور تک تکتا رہ گیا۔

ٹھیک ایک سال بعد آنگن نے اپنے کونے میں سر سبز سرو (cypress) پیڑ کے سائے تلے دو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تانیہ اور شایستہ کو کچھ راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوئے سنا۔ شایستہ، اپنی بڑی بہن کے ساتھ اپنے دل کے نہاں خانے میں بسے ہوئے ایک ذہین اور خوبرو لڑکے عارف کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی اور آنگن کو اب یاد آیا کہ ایک دن جو تصویر شایستہ کی کتاب سے آنگن کی آنکھوں کے سامنے گری تھی وہ کس کی تھی۔۔ اُس رات تانیہ نے اپنی بہن کی آرزوں کا چراغ روشن کر دیا اور یوں کچھ ہی مہینوں کے اندر اس گھر کی آخری پری کو بھی ایک شہزادہ آکر لے گیا۔۔

اسکے بعد وقت جیسے تھم گیا، ہوائیں جیسے رُک گئی، پھولوں کے چہروں پہ جیسے مردنی چھا گئی، آنگن کے جسم کو جیسے ایک دھند نے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ اُس گھر کی ساری پریاں یوں تو اپنے اپنے گھر کی ذمہ داریوں میں محو تھیں لیکن آنگن کو اپنے سونے پن کا احساس اس حد تک ستانے لگا کہ وہ آسمان پہ چمکتے ہوئے چاند کی جانب بھی دیکھنا گوارا نہ کر سکا۔۔ اکرم میاں اور ساجدہ بھی اب اکثر ایک دوسرے کی جانب کچھ ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جن میں یہ التجا بھی موجزن ہوتی تھی کہ ''مجھے سہارا دو'' اور یہ اطمینان بھی روشن ہوتا تھا کہ ''اللہ نے ساری ذمہ داریوں سے سرخروئی عطا کی، یہ بہت

بڑی بات ہے''

ایک رات کی سیاہی نے جب سحر کے آگے سرخم کر دیا تو اس گھر کے آنگن میں یہ خبر پہنچی کہ تانیہ نے ہسپتال میں ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ اکرم اور ساجدہ کے قدم زمین پر پڑنے کے بجائے اُڑنے پہ آمادہ نظر آرہے تھے اور شاید یہی اُڑان اُن دونوں کی آخری اُڑان ثابت ہوئی۔ ہسپتال جاتے جاتے اُن کی تیز رفتار کار ایک بھیانک حادثے کی شکار ہوگئی اور آنگن نے اپنے مالک اور مالکن کا مشترکہ جنازہ لہولہو تر آنکھوں سے دیکھا۔

ان دنوں رقیہ اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ گئی تھی جہاں اُنہیں شاید اس سانحے کی خبر نہ دی جاسکی۔ آنگن چار دنوں تک رقیہ کا انتظار کرتا رہا کہ شاید آج نہیں تو کل وہ رقیہ بیٹی کی بھیگی بھیگی پلکوں کو اپنے آنچل سے پونچھ سکے لیکن جب تک رقیہ اپنے شوہر کے ساتھ اُس آنگن میں چلّاتی، واویلا کرتی ہوئی آئی تب تک اکرم صاحب اور ساجدہ کا چہلم منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ان ایّام میں اگر کسی نے اس گھر کی لرزتی، گرتی دیواروں کو تھامنے کی کوشش کی تھی تو وہ تانیہ تھی۔۔ ایک بڑی بہن۔ ایک ماں۔۔ اور اسکے شانہ بشانہ سہارا بنے کھڑے تھے شایستہ اور اُسکا شوہر ــــــ تانیہ کو ان ایّام میں جہاں اپنے والدین کی جدائی کا غم اندر اندر ہی کُرید رہا تھا وہاں اُس کا اپنا شریک حیات اپنی سیم و زر کی دنیا میں اپنی بیوی کے ہر غم، ہر دکھ سے نا آشنا تھا۔ ان لمحات میں ایک شفقت بھرا ہاتھ اُسے ہر لمحے تھامنے کی کوشش کرتا تھا اور وہ ہاتھ تھا رحمان صاحب کا، رحمان صاحب اُسکا سسُر۔ رحمان صاحب اپنے بیٹے کی بے اعتنائی اور زر پرستی سے واقف تھا، وہ اپنی بہو کی معصومیت اور بے بسی سے بھی آشنا تھا۔۔ نہ جانے آنگن کو کیوں اُس میں اکرم صاحب کی شبیہ نظر آتی تھی۔

وقت کے ہاتھ میں ایسی کون سا مرہم ہوتا ہے کہ وہ ہر زخم بھرنے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔۔ یہ بات آنگن کے سمجھ سے بھی باہر تھی۔۔اسی کیفیت کے سائے تلے نئی امیدوں کے چراغ بھی روشن ہوتے ہیں اور یوں آنگن کی آنکھوں میں بھی نہ جانے کب رقیہ اور شایستہ کی گود میں مسکراتے پھول دیکھنے کی آرزو جاگی تھی۔۔ وہ ہر صبح، ہر شام ہاتھ اُٹھا کر دعائیں مانگنے لگا لیکن نہ جانے وہ دعائیں عرش سے نامراد ہو کر کیوں لوٹیں، رقیہ کے شوہر کو ڈاکٹروں نے ''بے بسی'' کا عنوان عطا کیا اور شایستہ کی کوکھ میں ایک کلی مرجھاتے مرجھاتے،، شایستہ کی زرخیزیت کو بھی اُجاڑ کر ادھورے راستے سے ہی واپس لوٹ گئی۔ دونوں کے آنگن روٹھ گئے، بہاریں ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی.........

بہاریں بلانے سے آتیں تو کوئی آنگن سونا نہ رہتا لیکن ان بہاروں کا بھی اپنا مزاج ہے یہ کہیں کہیں بن بلائے ہی پہنچتی ہیں، تانیہ نے والدین کی موت کے دو برس بعد ایک اور ننھی سی گڈیا کو جنم دے دیا۔ دوسری بیٹی کا منہ دیکھتے ہی عدنان کا چہرا لٹک گیا، رحمان صاحب اللہ کے دربار میں سر بہ سجود ہوئے ، اُس نے اپنی ساری جائیداد تانیہ کی بیٹیوں کے نام کر دی اور عرفان ایک میٹروپالیٹن شہر میں اپنی ٹرانسفر کرا کے خود اپنے گھر کے آنگن سے ہی ناطہ توڑ بیٹھا۔

وقت کے ستم انسان کی ہڈیوں کو بھی کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ یہ کھوکھلا پن دھیرے دھیرے انسان کے اعصاب پہ سوار ہوتا ہے اور ایک دن اسی کھوکھلے پن کی چادر پر انسان کی آخری سانس اپنا عکس چھوڑ جاتی ہے۔ رحمان صاحب پوتیوں کے ساتھ ساتھ بہو کے بارے میں فکر مند تو تھے ہی لیکن اب اندر ہی اندر اپنے اکلوتے بیٹے کی بے اعتنائی نے بھی انہیں اس حد تک کھوکھلا کر دیا تھا کہ وہ گھر کی چوکھٹ کے اندر ہی محدود ہو

کر رہ گیا اور اُسکے اپنے گھر کے آنگن نے کئی مہینوں کے بعد اُسے تب دیکھا جب اُسکے رشتہ دار اور محلے والے اُسے آخری سفر پر لے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس سانحے نے تانیہ کو تنکے تنکے بکھیر کے رکھ دیا بلکل ویسے ہی جیسے آنگن کے ایک کونے میں لگا وہ سرسبز سرو (cypress) کا پیڑ اب زردی مائل رنگت لئے اپنے اُجڑنے کا خود ہی ماتم منا رہا تھا۔ عرفان چند دنوں کی ماتم داری کے بعد تانیہ کو دو معصوم بچیوں کے پاس تنہا چھوڑ کر پھر اپنی سیم و زر کی دنیا میں گم ہو گیا اور یوں اکرم صاحب کے گھر کے آنگن نے وہ منظر بھی دیکھا جس کا اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا.......

تانیہ ایک دن اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ نڈھال تھکی ہاری، بیمار اور لاغر قدموں کے ساتھ آنگن کے پلکوں کو بھگونے آ گئی۔ اور......

ایک شام آنگن نے اپنی ڈوبتی دھڑکنوں کے ساتھ ایک حیران کن بات سنی۔

تانیہ نے اپنی دونوں بچیاں رقیہ اور شایستہ کی گود میں ڈال کر اُن کا آنگن مہکانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دوسرے دن نماز فجر کے بعد جب تانیہ کا جنازہ اکرم صاحب کے گھر سے نکلا تو آنگن کو ایسا لگا جیسے اُس تابوت میں تانیہ کے بدلے اُسکی اپنی میت جا رہی ہو.... سفید بے داغ کفن اوڑھے.. ہر غم اور ہر خوشی سے بے نیاز ☆☆

اپنے حصّے کی سحر

جب وہ سب کچھ ہو گیا تھا تب ہم تینوں بھائیوں نے اس دنیا میں پہلی سانس بھی نہیں لی تھی۔ لیکن ... جب ہم نے پہلی بار اپنی آنکھیں کھولی تھیں تو اُس موٹی کتاب میں اُس المیے کی ایک واضح تصویر نظروں تلے آ گئی تھی۔ اُس عورت کے جسم پر چلتی ہوئی آری کی کاٹ ہمیں اپنے اجسام پر بھی محسوس ہوئی تھی اور ہم اپنی پلکیں جھکا کر کچھ روئے اور کچھ شرمسار ہوئے۔ ہمارے دلوں میں جذبات کا طوفان مچلنے لگا اور ہم اپنی آنکھوں میں دہکتی چنگاریوں کی چُھبن محسوس کرنے لگے۔

یہ وہ دن تھے جب ہم تینوں بھائی ''ا ل م'' کا سپارہ مولوی صاحب کے پاس شروع کرنے لگے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی اصغر انہیں دنوں زور سے آمین کہنے لگا تھا اور میں رفیع ایدین کے بغیر بھی نماز ادا کرنے لگا تھا جبکہ ہمارا بڑا بھائی اکبر محرم کے جلوس میں شرکت کرنے لگا تھا۔

اِن دنوں بھی اُس عورت کو ذبح کیا جا رہا تھا جس کا المیہ ہم نے موٹی موٹی کتابوں میں پڑھا تھا۔ وہ لکیر کے اِس طرف بھی کٹ رہی تھی اور لکیر کے اُس طرف بھی.. فرق صرف اتنا تھا کہ لکیر کے اِس طرف اُس کا جھٹکا کیا جا رہا تھا اور لکیر کے اُس طرف چُھریاں چلانے والے اللہ اکبر کی تکبیر پڑھا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ہمارے جنم سے پہلے بھی جاری تھا اور اس سلسلے کا انجام ہماری سوچ کی حدوں سے آگے بھیانک

اندھیروں میں بھی مخفی تھا۔

اندھیرا ہمارے گھر میں بھی ہو رہا تھا۔ ہر شام جب بجلی کے قمقمے اچانک اپنی آنکھ بند کر دیتے تھے تو ہمارے کمرے کے در و دیوار اندھیرے کی گہرائیوں میں یوں ڈوب جاتے تھے جیسے گجرات کی زمین میں ہزاروں ذی روح غایب ہو گئے تھے۔ اُس اندھیرے میں ہم تینوں بھائی خاموشی سے لحاف اوڑھے خوبصورت خواب دیکھنے کی تمنا کرتے تھے لیکن تاریک راہوں سے کوئی حسین خواب چل کر نہیں آتا وہ بھی تب جب گلی کے ہر نکڑ پر پہرے لگے ہوں۔

ہر رات کمرے میں عجیب طرح کی آوازیں رقص کرتی تھیں اور یہ رقص تب تک جاری رہتا جب تک صبح صادق نمودار ہونے سے پہلے محلے کی مسجد سے موذن کی اذان نہ اُبھرتی: اشھد ان لا الہ الا اللہ

تب رقص تھم جاتا تھا۔۔ آوازوں کا سحر ٹوٹنے لگتا تھا اور ہم جیسے ایک طلسم سے آزاد ہو جاتے تھے، ہمارے ذہنوں پر چھائی ہوئی کائی جیسے چھٹ جاتی تھی۔

ہم تینوں نے اکثر ایک دوسرے سے بارہا اس پُر اسرار کیفیت کے بارے میں پوچھنے کی جسارت کی تھی لیکن اس اسرار میں ایسی کوئی بات پنہاں تھی کہ جسے دیکھنے یا سمجھنے کی صلاحیت ہم میں نہ تھی۔ لیکن جب ہم ایک صبح مولوی صاحب کے پاس پہنچے تو اُس وقت مولوی صاحب کتابوں کی دنیا میں غرق تھے۔ وہ جمعہ کی تقریر کا خلاصہ تیار کر رہے تھے۔ ہم بہت دیر تک اُن کے خوبصورت دیوان خانے کی چوکھٹ پر کھڑے اُن کی ایک نگاہ کے منتظر بنے رہے لیکن مولوی صاحب دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی تقریر کے لفظ تراشنے میں محو تھے۔ جب ہماری ٹانگیں دُکھنے لگیں تو ہم سر جھکائے گھر کی جانب لوٹ

آئے۔ بازار سے گذرتے ہوئے ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سارے دکاندار صرف سرخ لباس پہنے ہوئے کالے لمبے اجنبی لوگوں کو اپنا مال بیچ رہے تھے اور شہر کے مکین دکانوں سے دور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے لیکن سرخ لباس پہنے ہوئے اجنبی لوگوں کی لمبی قطاریں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ شہر والوں کی باری آنے تک دکان کا مال متاع لُٹ چکا ہوگا۔

ہم اپنا دامن بچاتے بچاتے مین مارکیٹ سے اُس گلی میں داخل ہوگئے جسکی نکڑ پر ہمارا گھر واقع تھا۔ گلی میں جا بجا بلیاں اور کتے ہر گھر کی چوکھٹ پر منہ مار رہے تھے۔ عجیب سا سماں دیکھنے کو مل رہا تھا۔ کہیں بلی کے غُرانے سے کتے کی دم جھک جاتی تھی اور کہیں کتے کے بھونکنے پر بلی دم دبا کر بھاگ جاتی تھی۔ ہم نے ایک جگہ رک کر تماشائی بننے کی کوشش کی لیکن اُسی لمحے بلی اور کتے نے مل کر ہمیں قہر آلودہ نظروں سے گھورنا شروع کر دیا جیسے اُنہیں مشاہدہ کرنے والوں سے ازلی بیر ہو۔

ہم تینوں بھائی سہمے، سکڑے اور تقریباً بھاگتے ہوئے اپنے گھر لوٹ آئے، گویا کوئی بات تھی کہ یہ مناظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔ ہم تینوں اپنی اپنی جگہ سوالوں کے اسیر بنے رہے۔

اُس رات جب ہم اپنے کمرے میں سونے کی غرض سے داخل ہونے لگے تو حسب معمول بجلی کے قمقمے اپنی آنکھ بند کر چکے تھے۔ ہمارے کمرے میں ماں نے ایک چھوٹا سا دیا روشن کر رکھا تھا۔ ہم نے جوں ہی اپنے کمرے میں قدم رکھنا چاہا تو ہمارے جسم دروازے پر ہی جیسے ساکت ہو کر رہ گئے۔ ہمارے کمرے میں رکھا ہوا دیا کمرے کی دیوار پر چسپاں خوبصورت عورت کی تصویر کے ارد گرد رقص کر رہا تھا اور کمرے کی فضاؤں

میں عجیب طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

اکبر دھیرے سے کوئی قرانی آیت پڑھنے لگا اور ہم دونوں بھائی اسکی تقلید کرنے کے لئے اُسکے قریب اپنے کان لے جاکر اُس آیت کو سننے کی کوشش کرنے لگے کہ اچانک.....

خوبصورت عورت تصویر سے اُتر کر کمرے کے وسط میں مجسم کھڑی ہوگئی۔ دیا اُسکے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر آکر ٹمٹمانے لگا۔ ہمارے ہونٹوں سے الفاظ غائب ہونے لگے۔ عورت زیرلب مسکرا کر ہمیں اپنے قریب آنے کا شارہ کررہی تھی۔ ہم تینوں بے سدھ تھے، تینوں پر جیسے کسی پُراسرار آسیب نے سایہ کیا ہوا تھا۔

ایسے میں مجھے ایک اُمید نے جیسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ مجھے نہ جانے کیسے یہ احساس ہونے لگا کہ ابھی تیز و تند ہوا کا ایک جھونکا کمرے کے دروازے سے گزر کر دیئے کی ٹمٹماتی لو کو بُجھا دے گا۔ کمرے کی ہر تصویر مٹ جائیگی، ہر منظر کھو جائے گا، خوبصورت عورت کا جسم ہوا میں تحلیل ہوجائے گا۔ بجلی کے قمقمے نور برسانا شروع کردینگے لیکن....

رات دبے پاؤں سرک تو رہی تھی لیکن میرے گماں کی ایک جھلک بھی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ ہم تینوں بھائی کمرے کے دروازے کی چوکھٹ کے قریب بُری طرح سے کانپتے رہے... خوبصورت عورت کا جسم، دیئے کی ٹمٹماتی لو، ایک عجیب سا ساز.. سب کچھ ویسے ہی تھا اور ہمارے قدم زمین میں بدستور دھنسے ہوئے تھے

اچانک... حالات کی وحشت، ذہن کے پردوں کو چاک کرنے میں کامیاب ہوگئی اور ہم تینوں بھائی ایک ساتھ چلّا اُٹھے [illegible] ہماری چیخیں [illegible] نیم تاریکی

میں گرتی پڑتی ہمارے کمرے تک آ گئی:

''کیا بات ہے میرے بچو...کیا ہوا؟''

''ہم نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ہم تینوں بھائی ایک ہی لحاف میں ایک دوسرے سے تقریباً چپکے ہوئے خوف کی لہروں پہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ دروازے پر ماں کھڑی تھی...نہیں...ہمیں دروازے پر ماں کے بدلے وہ عورت نظر آ رہی تھی جو لکیر کے دونوں طرف کٹ رہی تھی۔

ہم تینوں کی زبان پر ایک ہی سوال تھا ''سحر کب ہوگی؟....سحر کب ہوگی؟''

ماں یا پھر وہ عورت...وہ جو کوئی بھی تھی ہماری اندرونی کیفیت سے آشنا تھی۔ وہ ہمارے قریب آ گئی، ہمیں اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا، ہمارے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ہمیں دلاسا دینے لگی:

''میرے بچو...آج کی رات بہت لمبی ہوگی، بہت لمبی..کیونکہ سنا ہے اس شہر کے حصے کی سحر شام کو ہی بیچ چوراہے پر عریاں کر دی گئی ہے اور یہ خبر تو اب زباں زد عام ہے کہ اسکا سارا وجود تار تار ہو چکا ہے۔

یہ کہہ کر ماں یا شاید اُس عورت نے ہماری گود میں دم توڑ دیا اور کمرے کا تنہا دیا آخری بار بھڑک کر بُجھ گیا۔☆☆

شر پسند

''آپ کے حقوق دلوانا، میں اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں''..وہ سٹیج پر شیر کی طرح گرج رہا تھا اور لوگ تالیاں بجا کر اُسکی داد دے رہے تھے۔فلک شگاف نعروں کا شور اور ہواؤں میں لہراتے ہوئے اُسکی پارٹی کے جھنڈے اُسکے تابناک مستقبل کی غمازی کر رہے تھے کہ اچانک....

.....ایک قریبی گلی سے ایک عریاں شخص بچوں کی ایک بھاری فوج سے بچتا ہوا سٹیج کے سائے میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا...ہجوم اس پاگل کی مداخلت برداشت نہ کر سکے اور اُسے سٹیج کے سائے سے گھسیٹ کر باہر نکال لائے۔

اب کچھ نوجوان اُسکے پیچھے دوڑے، گلی کے نکڑ تک......

چند لمحوں کے بعد...عریاں شخص اُس پارٹی کے جھنڈے سے اپنے عریان خون آلودہ تن کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتا رہا اور مقرر کی آواز لاوڈ سپیکر پر پھر سے گونجنے لگی...

''لوگو...کبھی کبھار کوئی شر پسند عنصر میرا جلسہ بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن میں................''

☆☆☆

پاگل گلی کے نکڑ پر دم توڑ چکا تھا

جہلم کا تیسرا کنارا

سونہ جو جس ہاوس بوٹ میں رہتا تھا وہ ایک رات سیلاب میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہہ گیا تھا۔ نہ جانے سونہ جو کا کون سا سجدہ اللہ کے دربار میں ادا ہوا تھا جسکے طفیل اُسکا ایک مختصر سا کنبہ اُس آفت ناگہانی میں بچ گیا۔ جب ہاوس بوٹ کا پہلا تختہ الگ ہو کر بہہ گیا تھا تب سونہ جو کی بیوی راجہ کو ہی اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ برسوں سے مرمت کی دہائی دینے والا اُنکے پرکھوں کا ہاوس بوٹ اپنے سارے حوصلے آج کے سیلاب میں ہار چکا ہے......وہ بے اختیار چلائی تھی اور یوں اُس پورے کنبے نے جہاں اپنی گھر گرہستی کو جہلم کے پانیوں میں ڈوبتے اور بکھرتے ہوئے دیکھا تھا وہیں ایک کنارے پر وہ ایک دوسرے کو بارش میں چھتیڑوں کی مانند بھیگے ہوئے دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ سب زندہ تھے۔

لیکن وہ سب زندہ تھے........سونہ جو بھیگی بھیگی آنکھوں سے اپنے گھر کو بکھرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ جس گھر میں پچھلی چھ دہائیوں سے رہ رہا تھا اُسے جہلم نے آج ایک ہی لمحے میں نگل دیا تھا۔ جہلم کے آس پاس کناروں پہ رہنے والے گھروں میں اندھیرا چھایا

تھا، کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ رات کی اس بھیانک تاریکی میں اُن کے قریب رہنے والے ایک تنہا ہاوس بوٹ کے مکینوں پر کیا گذری ہے... کہنے کو تو وہ سب آس پڑوس والے ایک زمانے میں سونہ جو کی طرح ہی ہاوس بوٹوں میں رہتے تھے لیکن دھیرے دھیرے اُنہوں نے اپنے اپنے حصے کی زمین حاصل کر کے اپنا اپنا ایک پختہ اینٹوں کا گھر بنالیا تھا اور شاید اسی لئے وہ اس طوفانی رات میں قدرے پرسکون تھے.........انہیں کم از کم یہ اطمینان تھا کہ یہ طوفانی، تیز و تند برق و باراں اُن کے کنکریٹ مکانوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی لیکن ....سونہ جو کا سارا گھر، سارا اثاثہ اس بارش کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ اپنے عیال کو بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ چاروں طرف نیم تاریکی کا عالم تھا، کبھی کبھار آسمان پہ جب بجلی کھڑکتی تھی تو سونہ جو کو اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ اپنے جوان بیٹے مختار اور بیٹی محبوبہ کے چہرے پر چھائے ہوئے خوف اور ماتم کے عکس نظر آتے۔ یہ کنبہ ایک چنار کے پیڑ تلے بادو باراں سے بچنے کی سعی لا حاصل کر رہا تھا لیکن چنار کا وہ درخت تو خود موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُسکے بازو ابھی کٹ کر گر جائینگے اور وہ زندگی بھر کے لئے اپاہج بن کر رہ جائے گا اور اُسی بے بس پیڑ کے تنے سے قدرے چپکی ہوئی جوان، کنواری بیٹی محبوبہ کے چہرے پر بہتی ہوئی دھار کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگانا ہی مشکل تھا کہ بارش کے قطرے کون سے ہیں اور آنسوؤں کے قطرے کون سے ....سونہ جو کا بیٹا غم و یاس کی تصویر تو بنا تھا لیکن اُس کے اندر ایک لاوا ابھی اُبل رہا تھا، کئی مہینوں سے وہ اپنے باپ کو ہاوس بوٹ سے نکل کر جہلم کے کنارے ایک جھونپڑی تعمیر کرنے کی صلاح دیتا آ رہا تھا لیکن سونہ جو جانتا تھا کہ کنارے کی جھونپڑی باتوں سے تعمیر نہیں ہوتی.....

راجہ اب پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تھی سونہ جو نے تینوں کو چنار کے اُس پیڑ سے نکل کر قریب کے کسی ہمسائے کی چوکھٹ تک چلنے کی صلح دی اور تینوں اپنے بھیگے بھیگے جسموں اور ٹھٹھرتی روحوں کے ساتھ ہمسایہ خالق مٹہ کے مکان کی چوکھٹ تک آپہنچے .... بہت دیر تک خالق مٹہ یا اُسکے گھر والوں نے اُنکی آہ و پکار نہیں سنی۔ یا تو برق و باراں کے شور میں اُن کی آواز دب جاتی تھی یا خالق مٹہ اور اُسکا کنبہ بے خبر نیند سویا ہوا تھا.....................

دنیا کا ایک نرالا دستور ہے، یہاں بھوکے کو بھی مرنے سے پہلے دو قطرے پانی کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔ عمر بھر جس کو تن ڈھانپنے کے لئے بھی دو گز کپڑا میسر نہیں ہوتا اُس کی میت کو مرنے کے وقت بھی چودہ گز کپڑے کا کفن دیا جاتا ہے۔ دنیا بڑی عجیب ہے، مرتے ہوئے کی کوئی فکر نہیں، میتوں کے لئے ہر کوئی کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے سامنے آتا ہے......

سونہ جو اور اُسکے کنبے کو کئی مہینے تک موت و حیات کا اصلی رنگ دیکھنا پڑا۔ اپنے گھر کی بوسیدہ سی چار دیواری میں آدمی فاقے سے بھی رہے تو بھی شان سے جینے کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن جب بے سروسامانی کی حالت میں آدمی اپنے رشتہ دار کے گھر میں پناہ لے اور اُسکے پاس کھانے کے لئے دو لقمے اور پہننے کے لئے دو کپڑے نہ ہوں تو زندگی ایک اژدھا ہے کی طرح پھن پھیلاتی ہوئی نظر آتی ہے.... رہنے کو تو سونہ جو کا کنبہ بھی سر چھپانے کے لئے جہلم کے دوسرے کنارے پہ کھڑے ایک اور ہاوس بوٹ میں منتقل ہو گیا تھا لیکن رحمان ملہ کا یہ ہاوس بوٹ اُسکے اپنے عیال کے لئے بھی وسیع دل نہیں رکھتا تھا۔ ایسے میں ایک ہی کونے میں بے سروسامانی کی زندگی کو نئے سرے سے

شروع کرنا...... یہ کیفیت خود سونہ جو بیان کرنے سے قاصر تھا لیکن جب دو ہفتوں کے بعد رحمان ملہ نے اُسے ایک رات اپنے کمرے میں بُلا کر اُسکے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ کہہ نہ پیا

''سونہ جو: اس طرح خاموش رہنے سے اگر انسان کی مصیبتیں ختم ہوتیں تو ان دو ہفتوں میں حکومت نے تمہاری کوئی مدد کی ہوتی''

''نہیں... اُس کے لئے تو مختار کئی دنوں سے وزیر وزارت کے چکر لگا رہا ہے... انشاءاللہ کچھ دنوں تک ہمیں ایک ہاوس بوٹ بنانے کے لئے کچھ لکڑی اور نقدی ملنے والی ہے''

''بس یہی خواب دیکھتے رہو... تم کیا سمجھتے ہو حکومت کو اس سیلاب اور طوفان سے ہوئی تباہ کاری کے بجائے صرف تمہارے اُس خستہ حال ہاوس بوٹ کی فکر ہوگی... سونہ جو، خود کچھ سوچو، یہ حکومتیں ہم غریبوں کو صرف ووٹ کے دن یاد رکھتی ہیں''

''اللہ بڑا کارساز ہے رحمان بھائی، دیکھتے ہیں اُس نے ہمارے مقدر میں کیا لکھا ہوگا، ویسے بھی میں اپنا کنبہ لے کر تمہارے پاس زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ تم لوگوں کو بھی جگہ کی تنگی ہو رہی ہے''

''ارے نہیں؛ تم چاہو تو اس گھر میں ایک سال تک رہ سکتے ہو... یہ تو تمہارا ہی ہاوس بوٹ ہے''

یہ سب باتیں ایسے ہر موقعے پر سننے کو ملتی ہیں۔۔ یہ سونہ جو بھی جانتا تھا اُسنے بھی بہت ساری دنیا دیکھی تھی۔ جوانی میں وہ اپنا ایک خوبصورت شکارا لیکر دنیا بھر کے سیلانیوں کو چار چناری اور نہرو پارک تک لے جاتا تھا لیکن پھر اُسکی ڈھلتی جوانی کے

ساتھ ہی اُس کی ہمت جواب دینے لگی۔ ایہ وہ دن تھے جب اُسکا بیٹا مختار جوان ہو چکا تھا لیکن جب مختار نے باپ کے پیشے کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا تو سونہ جو کو پہلی بار یہ احساس ہو گیا کہ اُس کا برسوں پرانا گھر (ہاوس بوٹ) ٹوٹنے لگا ہے.....مختار نے باپ کو دوٹوک لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ سیلانیوں کا غلام بن کر اپنی زندگی نہیں گزار سکتا۔

سونہ جو جہاں دیدہ تھا اُسے اپنے بیٹے کے ذہن میں اُبھرتے ہوئے شعلوں کی تپش اپنے جسم و جگر میں محسوس ہوئی تھی لیکن اُسے اولاد کے مستقبل کی بھی فکر تھی اور جب ایک دن مختار نے اپنے مستقبل کا خاکہ خود ہی پیش کیا تو سونہ جو کو ذرا بھر بھی حیرت نہ ہوئی ....مختار شال پھیری کرنے کے لئے کلکتہ جانا چاہتا تھا...اور اس فیصلے کے کچھ ہی دنوں بعد سیلاب نے سونہ جو کی ساری گھر گھر ہستی کو تاراج کر دیا تھا۔۔۔۔

چند دنوں کے بعد مختار شال بیوپاری سے کچھ شال لیکر رحمان ملہ کے ہاوس بوٹ میں داخل ہوا اور سب سے پہلے رحمان ملہ کو ہی پتہ چلا کہ مختار اپنے گھر والوں کی فکر کرنے کا نیا جواز پیش کر رہا ہے..رحمان ملہ جب اُس سے گٹھری کے بارے میں پوچھ رہا تھا اُسی لمحے اندر سے سونہ جو بھی باہر آ گیا، شام کی روزی روٹی کا بندوبست کرنے کے لئے

"آؤ سونہ جو آو۔۔مبارک ۔۔تمہارا بیٹا تو ایک نیا کاروبار کرنے نکلا ہے"

سونہ جو کو رحمان کے لہجہ کچھ ہتک آمیز لگا لیکن جب اُسنے اپنے بیٹے کی زبان سے یہ سنا کہ وہ اگلے دن کچھ دوستوں کیساتھ کلکتہ جانے کی پکی تیاری کر چکا ہے تو اُسے اپنی بوسیدہ ٹوپی میں ہزاروں شگاف نظر آئے

"بیٹے ابھی ہمیں اپنے سر چھپانے۔۔۔"

"ابو سر چھپانے کا معاملہ جب تک حل ہو گا تب تک کلکتہ کا سیزن میرا انتظار

نہیں کرسکتا.. آپ کچھ انتظام کیجئے، میں لوٹ کر آپکی مدد کرونگا... تب تک میرے ہاتھ میں کچھ پیسے آچکے ہونگے''

رحمان ملہ سونہ جو کو تکتا رہ گیا اور سونہ جو اپنی خفت بھی نہ مٹا سکا

دوسرے دن پو پھٹتے ہی مختار جا چکا تھا اور اُسی دن سونہ جو نے کہیں سے کچھ لکڑیاں اور گھاس پھوس جمع کر کے جہلم کے کنارے ایک جھونپڑی بنانے کا ایک صبر آزما کام شروع کیا۔ کچھ راجہ نے اور کچھ محبوبہ نے باپ کا ہاتھ بٹایا اور ایک ہفتے کے بعد وہ رحمان ملہ کے ہاؤس بوٹ سے اپنی جھونپڑی میں منتقل ہو گئے۔ اُس رات راجہ نے کھانا پروستے ہوئے مختار کو بہت یاد کیا

''کاش آج مختار بھی ہمارے پاس ہوتا۔ آج ڈیڑھ سال کے بعد اپنے گھر میں کھانا پروس رہی ہوں۔ اتنے دنوں ایسے لگ رہا تھا جیسے سب کچھ کسی نے بھیک میں دیا ہو''

''جھونپڑے کے واحد کمرے میں کوئی کچھ نہ بولا، ہر ایک کی اندرونی کیفیت ایک جیسی تھی۔ بات تب طول پکڑتی ہے جب تضاد کے دھاگے میں پروئی جائے ۔۔۔ اُس وقت سب خاموشی سے روکھی سوکھی کھانے لگے۔''

دوسری صبح جب سونہ جو نیند سے جاگ کر جھونپڑی سے باہر نکلا تو اُسکی نگاہوں کے سامنے جہلم کے اُس پار اُسے وہ جگہ نظر آئی جہاں برسوں تک اُس کا گھر ایک ہاؤس بوٹ کی شکل میں موجود تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے اب وہاں پانی کی ایک قبر ہو جس میں وہ خود دفن ہو چکا تھا.. اپنی اس سوچ سے چھٹکارا پانے کے لئے حسب فطرت اُسنے اپنے آپ کو ایک جھٹکا دیا اور پیچھے مڑ کر اپنی چھوٹی سی دنیا، چھوٹی سی جھونپڑی کو دیکھنے لگا

۔۔۔زندگی بھر اُسنے یہی کچھ تو سیکھا تھا۔۔گذرے لمحوں کو بھول کر نئی ساعتوں کا خیر مقدم کرنا لیکن

آنے والی ساعتوں نے اُسے ایک نیا جھٹکا دیا۔۔۔

ایک دن علی الصباح حکومت کے دو کارندے اُس کی جھونپڑی کے باہر اُسے بلانے لگے

محبوبہ نے جھونپڑی کے اندر نمکین چائے بناتے ہوئے اُنکی آواز سنی۔۔سونہ جو اس وقت فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ راجہ کی طبیعت اُسدن ناساز تھی، وہ دو دن سے بخار میں تپ رہی تھی۔۔حکومت کے کارندوں کی آواز نے سونہ جو کی عبادت میں بھی خلل ڈال دیا اُسنے جلدی جلدی فرض ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

۔باہر حکومت کے کارندوں کو دیکھ کر پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہ پایا کہ کیا ماجرا ہے لیکن جب اُس نے کارندوں کے عقب میں ایک دیو ہیکل بلڈوزر کو بھی آتے ہوئے دیکھا تو اُسے یوں لگا کہ اُسکی زندگی کا آخری سیلاب اُس کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے

.............وہ صرف ملتجی ہوا

''میں بے آسرا کہاں جاؤں، کیا یہی حکومت کی امداد ہے۔اُس کنارے میری ایک دنیا اُجڑ گئی، کیا اس کنارے آپ میری یہ دنیا بھی تاراج کرنا چاہتے ہیں۔آخر میں اپنی بیمار بیوی اور جوان بیٹی کو لیکر کہاں جاؤں''

''جہاں بھی جاوگے خیال رکھنا، جہلم کے دونوں کناروں پر ناجائز تعمیرات کو زمین بوس کیا جائے گا''

''تو بھائی میرے.....جب اس جہلم کے یہ دونوں کنارے ہم غریبوں اور

بے سہاروں کے لئے ممنوع ہیں تو آ و میرے اس گھر کو زمین بوس کر دو... میں... میں .. اپنے لئے اور اپنے عیال کے لئے جہلم کا تیسرا کنارا ڈھونڈ ہی لونگا جہاں ہم لوگوں کا گھر نہ سہی قبریں تو بن سکیں گی"

کارندے پیچھے مڑ کے دیکھ رہے تھے...شاید سونہ جو کی بے بس نظروں کا تاب ہی نہ لا سکے تھے۔

لیکن دروازے پہ آنسو بہاتی ہوئی محبوبہ اور بخار سے کپکپاتی ہوئی راجہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ اُن کا سرپرست سونہ جو اپنا دماغی توازُن کھو چکا ہے۔"

بلڈوزر کارندوں کے اشارے پر آگے بڑھ چکا تھا............☆☆

واپسی

"کیا کہا...؟" رادھا نہ جانے کتنی دور پہنچ چکی تھی۔ وہ موہن کی آنکھوں میں پیدا شدہ اُس عجیب سی چمک کو دیکھ رہی تھی جس چمک کے بارے میں اُس کا ہمیشہ یہی نظریہ رہا ہے کہ اسی چمک نے اُسے موہن کی طرف مائل کیا تھا...رادھا زندگی کے اُن لمحوں کی پھڑ پھڑاہٹ سننے لگی جو اُسکے گزرے کل کا عکس لئے ہوئے تھے۔

اُسدن جب وہ ایک تنہا تنہا سی جگہ پہ موہن کے ساتھ بیٹھی تھی۔تب موہن کی اندرونی کیفیت غیر معمولی الفاظ تراش رہی تھی:

"رادھا..میں من کی شانت دنیا میں رہنا چاہتا ہوں، کاش محبت دکھانے کا کوئی اور طریقہ ایجاد ہوتا جس میں جسم کی تپتی شعاعوں اور جذبات کی مچلتی لہروں کا کوئی دخل نہ ہوتا۔۔میں محبت کی ایک نئی تکمیل کا موجد بننا چاہتا ہوں"

"لیکن ایسی محبت کو کیا نام دو گے تم، محبت ایک جذبہ ہی تو ہے" رادھا کا لہجہ جذبات میں اُلجھا ہوا تھا۔

"ہے رادھا محبت جذبہ ہی تو ہے لیکن بے قرار مچلتے دل کا نہیں، یہ پُر سکون

لاشعور کے مندر کا وہ جذبہ ہے جسمیں طوفان کا اندیشہ تو ہوتا ہے لیکن طوفان کی موجیں ساحل کی گود میں گہر لاکر ڈال دیتی ہیں''

'' میرے فلسفی موہن۔ تم نہ جانے کیا کیا سوچ کر اپنا ذہن منتشر کر رہے ہو۔ تمہیں پیار چاہئے نا۔ محبت کا انمول موتی چاہئے نا.. بھول جاو نا کہ کل کیا ہوگا، آو میں تمہیں محبت کا ہار پہنادوں''

''نہیں رادھا۔۔۔ میں دیوی کے گلے سے انمول ہار اُتار کر زردار بننے کی سوچ بھی نہیں سکتا''

چوری کرنے کو کون کہہ رہا ہے، میں تمہیں اپنا ہار خود دے رہی ہوں''

''نہیں رادھا نہیں۔ مجھے دیوی کا اُپکار نہیں چاہئے، مجھے پوجا کا وہ انداز چاہئے جس میں پھل پانے کی آرزو بھی نہ ہو''

''ارے میرے پجاری۔ تم جذبات کے جنون میں یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہم جذبات اور احساست کی ماٹی سے بنائے گئے پتلے ہی تو ہیں، ہماری قیمت، ہمارے جذبات کی گہرائی سے بے شک نہ لگائی جائے لیکن ہم ہر چیز کی قیمت اپنے جذبے اور احساس کو بروے کار لاکر ہی لگا سکتے ہیں، جذبات اور احساسات نہ ہوتے تو پھر دل کے اس شہر میں بھی ارمانوں کے بازار نہ سجتے''

''دل، ارمان، جذبہ، احساس.... میں اسی روائیت سے بھاگنے کا خواہشمند ہوں' موہن کے لہجے میں احتجاج کا رنگ عیاں تھا۔

''یہ بغاوت بھی تو تمہارے جذبے اور تمہارے ارمان کی ہی ایک جھلک ہے'' اس میں بھی تمہارے جذبات کا دخل ہے'' رادھا کا حوصلہ بھی بلند تھا۔

''نہیں...اس میں میرے جذبات کا کوئی عنصر نہیں...میں محبت کی اُس منزل کو پانے کی جستجو کرنا چاہتا ہوں، جہاں خواہشات کا گذر نہ ہو، جہاں تن کو پانے کا خیال بھی ذہن میں نہ اُبھرے، جہاں تن اور من کا جھگڑا نہ ہو، جہاں تیرے اور میرے درمیان کسی رشتے کی ڈور، کسی جذبے کی زنجیر نہ ہو بلکہ میں تمہارے ساتھ یوں منسلک رہوں جیسے میں خود اپنے آپ سے منسلک رہتا ہے''

''اپنے آپ سے بھی منسلک ہونا بھی ایک احساس اور جذبے کا ہی ایک رنگ ہے، انسان خود سے بھی کچھ توقعات رکھتا ہے، انسان کو اپنے ہی کام سے کبھی ٹھیس پہنچتی ہے، اُسکے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔کامیابی ملتی ہے تو احساس کے چمن میں مسرتوں کے پھول کھلتے ہیں..زندگی خوشی اور غم کا سنگم ہی تو ہے''

''یہی تو میں نہیں چاہتا، میں محبت کو احساس کی ترازو سے نہیں، دل کی بے قراری سے نہیں، ارمانوں کی بارات سے نہیں بلکہ ایک نئے انداز سے اپنانا چاہتا ہوں میں تم سے محبت کر کے محبت کے دامن میں کسی خواہش کا داغ نہیں لگانا چاہتا، میں محبّت کو بے غرض اور بے نام روپ میں دیکھنے کا خواہشمند ہوں ۔نو گیو اینڈ ٹیک......... No give and Take.....'' موہن اپنی ڈگر پہ گامزن تھا۔

اسی تضاد نے ایک سال کو بھی پیچھے چھوڑ دیا....

آج دونوں ایک ہی میز کے اردگرد ایک سال قبل کے اُس منظر میں کھو گئے تھے ،رادھا کے ہاتھ یوں تو سویٹر بُننے میں مصروف تھے لیکن ذہن کی رو کہیں اور رقص کر رہی تھی ،موہن بھی سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتا ہوا ماضی کی دھند میں کھو گیا تھا۔وہ اپنے آپ میں گم ہو گیا تھا اور شاید اُنہی انجان خیالوں کی رہ گذر پر وہ خود سے ہی مخاطب تھا

''میں جذبات سے بغاوت کرنے نکلا تھا ، میں ایک نیا راستہ تلاش کررہا تھا لیکن میرے قدم کہاں آکے رک گئے.......میں تن اور من کی ان بھول بھلیوں میں کہاں کھوگیا....کہیں یہ کائینات خود بھی ایک جذبے کی بنیاد پہ قائیم تو نہیں ہے...

''رادھا...'' موہن اچانک رادھا کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا.....''رادھا...کیا میں بلاخر ہار گیا؟''

رادھا نے بنیان کے ایک دوسرے میں الجھے ہوئے دھاگوں سے نظریں ہٹا کر موہن کی جانب عجیب نظروں سے دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھری اور اسی لمحے پاس ہی خوبصورت لال لال اونی دھاگے کے گولے سے کھیلتے ہوئے اُن کے ننھے منے بچے نے بھی ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا

..................اور موہن اُن دونوں کو تکتا رہ گیا۔۔ ☆☆

ایک کہانی تیرے بغیر

پہلے ورق کی خاموش سلگتی کہانی کے آگے اُس جانے پہچانے راستے پر تیرے ہی قدموں کا عکس تھا اور یہی نقوش دوسرے نیلے رنگ کے صفحے کے گواہ تھے۔ اس صفحے پر پھیلی ہوئی لاتعداد لکیریں اور بے شمار نکتے اس بات کے غماز تھے کہ ہم آہنگی مختلف نکتوں کو مستقبل کی نت نئی راہوں میں دور تک لے جا کر بھی نہیں تھکتی لیکن یہ کیا.... چند نکتے خود ہی سمٹ کر قصہ پارینہ بن چکے تھے۔

کتاب کا تیسرا صفحہ سبز خوبصورت رنگ میں رنگا ہوا تھا، وہ اپنی ایک پُر کیف کہانی سنا رہا تھا۔ اس صفحے پر وسوسوں کا گزر نہ ہوا تھا۔ ہر کونے میں مستقبل کے سنہری سپنے سجنے لگے تھے۔

میں سپنوں کی اس دنیا میں کئی بار کھو چکا ہوں......

......اس دنیا کے آخری سرے پر پہنچنے سے پہلے ہی فریب کا ایک فلک بوس پہاڑ راستہ روک لیتا ہے:

''تم اس پہاڑ کو اپنی کہانی کی ایک علامت نہیں بنا سکے کیوں؟'' تم نے پوچھا تھا

''وہم ہے تمہارا'' میں نے کہا تھا اور مجھے یاد ہے میں نے اپنے ہونٹ تمہارے بالوں پر ثبت کئے تھے۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو... آؤ... سب کچھ بھول کر ایک دوسرے میں کھو جائیں، شاید پھر یہ لمحہ ملے نا ملے...''

اور میں تمہاری خودسپردگی میں کھو گیا... کھوتا رہا... اور آج بھی کھویا ہوا ہی تھا کہ ماضی کے دھندلکے سے کوئی مضبوط ہاتھ اُبھر آیا اور مجھے اپنے تصور سے باہر نکال دیا، لیکن جہاں اُسنے مجھے پہنچا دیا، وہاں بھی تم ہی کھڑی تھی... تم... جس کی تعریف میں، میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملا سکتا۔ لیکن یہ کیا.. آج تم اکیلی نہیں تھی، آج تمہارے ہمراہ تمہارا مستقبل تھا، میرے خوابوں کی طرح ایک رنگین مستقبل۔

میں نے گھبرا کر کتاب کے تینوں پنّوں کو دیکھا۔ تینوں پنے تیزی سے رنگ بدلنے لگے تھے... پہلا دودھیا سفید صفحہ سیاہ ہونے لگا تھا۔ دوسرے کی نیلاہٹ کچھ اور گہری ہونے لگی تھی اور تیسرا صفحہ خزاں کے پتے کی مانند زرد ہونے لگا تھا.... لیکن صفوں کے الفاظ کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔

تم اب بھی میرے روبرو کھڑی تھی، اپنے رنگین مستقبل کے ہمراہ..... نہ جانے تم کیا سوچ رہی تھی کہ اچانک تم نے میری جانب ایک سفید کورا کاغذ بڑھا دیا

''لو..... اسے اپنی کتاب میں سجا کر اس پر اپنی نئی کہانی لکھ دو.. میں ایک دن آؤنگی. تم سے تمہاری نئی کہانی سننے''

میں کہانیوں کی دنیا سے دور آ گیا ہوں'' میرے لہجے میں اُداسی تھی

''کہانیوں کی دنیا سے کوئی لوٹ کے نہیں آتا'' تمہارے لہجے میں وہی پرانی ادا

تھی جو اکثر میرے ذہن و دل میں عجیب طرح کی دنیا آباد کرتی ہے۔

''میرا قلم سوکھ چکا ہے.. میں اب کہانیاں نہیں لکھتا'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا تھا

''وقت کے سمندر سے چند قطرے نکال کر اُسکی پیاس بُجھا دو، لکھو، کیونکہ تم مجھے لکھتے ہوئے اچھے لگتے ہو'' اسکے بعد تم پھر اپنے حسین مستقبل میں کھو گئی تھی۔

میں ....وقت کے سمندر میں کود پڑا... نہ چاہتے ہوئے بھی میرا قلم نئی کہانی کے لئے نیا کردار تلاش کرنے لگا.. جیسے میں اپنی نہیں تمہاری خواہش پوری کر رہا تھا.. ماضی کی طرح......تب بھی تو میں تمہاری ایک خوشی کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے پہ تلا ہوا نظر آتا تھا۔ سمندر کی سطح پر ہی مجھے کئی چہرے ملے، جنکی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا سکتے تھے لیکن میں ...شاید تمہیں ڈھونڈ رہا تھا پہلی بار مجھے اپنی کہانی میں تمہارے کردار کی کمی محسوس ہو رہی تھی ....میں اب تیری شبیہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن سمندر کا پانی جیسے زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ مجھے تو کوئی چہرا نظر ہی نہیں آیا۔

میں نے سر اٹھا کر ساحل کی جانب مایوس نگاہوں سے دیکھا۔ میری کتاب سمندر کے ساحل پر تنہائی کے کیڑوں سے گھبرا کر مجھے بُلا رہی تھی۔۔۔ میں جب دوڑتا ہوا اپنی کتاب کے قریب پہنچا تو مجھ سے پہلے تم وہاں پہنچ گئی..... ہاں تم..... جسے میں تلاش کر رہا تھا.... میں رُک گیا... مجھے تمہاری گہری نیلی آنکھوں میں کئی سوال رقص کرتے ہوئے نظر آئے... لیکن تم تو وہاں تھی ہی نہیں.. میں نے جب آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطروں کو پونچھ کر غور سے دیکھا تو تم وہاں نہیں تھی ...صرف میری کتاب مجھے بلا رہی تھی

میں نے بوجھل ہاتھوں سے اپنی کتاب اُٹھائی اور گھبرا کر اپنے پرانے صفحوں کو ایک نظر دیکھنا چاہا لیکن... کتاب کے وہ تینوں صفحے کیڑوں کی غذا بن چکے تھے اور کتاب کے آخر مین تمہارا دیا ہوا وہ چوتھا صفحہ ایک نئی کہانی کا قرطاس بن چکا تھا۔ کیڑے اُس پر ایک نئی کہانی لکھ چکے تھے..................

میں نے نہیں بلکہ میری روح کو کئی برسوں کے بعد پتہ چلا کہ چوتھی کہانی نے تہلکہ مچا دیا ہے اور تم نے بھی اپنے خوبصورت لان میں ایک آرام دہ کرسی پہ نیم دراز ہو کر وہ کہانی پڑھ کر بس اتنا کہا تھا

''کتنا اچھا لکھتا تھا وہ...... تبھی تو مجھے صرف لکھتے ہوئے اچھا لگتا تھا...



سکوت

--- مجھے افسانوں کی ادا سے پیار ہے اور مجھے شاعری کی زُلفوں سے چھیڑ خوانی کرنے میں بھی ایک سرور ملتا ہے۔ میں ایک تصویر کی طرح ہر رنگ میں خود بھی رنگ جانا چاہتا ہوں اور مجھے ساز و سنگیت سے بھی دیوانگی کی حد تک اُنس ہے۔۔لیکن۔۔۔۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں نہ افسانہ نگار ہوں، نہ ڈرامہ نویس، نہ شاعر ہوں اور نہ ساز اور آواز کی دنیا کا کوئی ستارہ۔۔۔ میں ایک مسافر ہوں۔ ایک ایسی شاہ راہ کا جس میں مجھے افسانے، گیت، غزلیں، ڈرامے سرِ راہ مل جاتے ہیں سنگ میل کی طرح جو ہر گام پہ قدموں سے لپٹ جاتے ہیں اور ذہن و دل کو گزری مسافت اور آنے والی منزلوں کا پتہ دیتے ہیں۔

میں اپنی ہی دُھن میں چلا جا رہا ہوں۔ میں ان راہوں پہ اکیلا نہیں۔ بہت بھیڑ ہے ان راہوں پہ، کچھ زادِ راہ لئے چل رہے ہیں اور کچھ اپنی خالی جیب میں بار بار اپنے ہاتھ ڈبو کر کسی ''گوہر'' کی تلاشِ لا حاصل کر رہے ہیں۔ میں اللہ کا شکر گذار ہوں کہ اُس نے مجھے اِس راہ پہ چلنے سے پہلے اپنے عالم و فاضل والد صاحب کی شفقت عطا کی۔ اُس کے بعد کئی بلواسطہ اور بلا واسطہ محترم رہبروں کی رہبری عطا فرمائی۔

اب یہ نقادوں کے ساتھ ساتھ قارئین کرام کی چشمِ بینا ہے کہ ؎

نکتوں کو وہ عطا کریں خاکہ کوئی حسین

زاہد مختار



زاہد مختار

لرزتی رات باقی ہے، ابھی تم ساتھ مت چھوڑو
نفی اثبات باقی ہے، ابھی تم ساتھ مت چھوڑو
جنونِ دل کی سرحد سے، سکونِ دل کی وادی تک
ابھی سکرات باقی ہے ابھی تم ساتھ مت چھوڑو

JEHLIM KA TEESRA KINARA

Zahid Mukhtar

اتنے سال۔۔۔ نہ شناسائی نے دوستی کی قبا پہن لی اور نہ ہی دوستی نے اجنبیت کا کفن اوڑھ لیا۔ رشتے مر جاتے تو آدمی زندگی کی ہزار ہا بندشوں، مجبوریوں اور اذیتوں سے بچ جاتا لیکن رشتوں نے شاید اپنے مقدر میں ''فنا'' کا لفظ لکھوانا قبول نہیں کیا ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو دنیا کا ہر حرف اپنی لوحِ مقدر میں لکھ دیتا ہے اور جب اُن میں سے ہی کوئی لفظ اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ اُسکے سامنے سراپا پیکر بن کر اُسے اذیت ناک لمحوں کا اسیر بنا دیتا ہے تب وہ اپنے نصیب کو کوستا ہے، اپنی زندگی کی کتاب سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتا ہے

زاہد مختار



منٹو سے مختار تک افسانوں کے ارتقا کا گراف کھینچنے والوں کے ہاتھ میں ایسا کون سا Marker ہے جو دوسروں کو استعمال کرنا نہیں آتا، کچھ تو ہے جو شعور کی وسعتوں میں تفاوت کا ضامن ہے۔

زاہد مختار، منٹو یا غالب نہیں بن سکتا لیکن غالب یا منٹو بھی تو مختار کے قالب میں سما نہیں سکتا۔